قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ہفتہ وار طلوعِ اسلام کراچی

جلد ۸
شمارہ ٦

ہفتہ ۱۲ مارچ ۱۹۵۵ء

قیمت چار آنہ
سالانہ دس رو

قران نے کیا کہا

حکیم نے کہا کہ یہ دوائی بڑی مفید ہے لیکن اس کے ساتھ پرہیز بڑا سخت ہے۔ سات دن تک صرف بیسن کی روٹی کھانی ہوگی۔ مریض نے پہلے دن بیسن کی روٹی کھائی تو اسے لذیذ محسوس ہوئی۔ دوسرے دن کھائی تو طبعیت نے بے رغبتی سی ظاہر کی۔ تیسرے دن اس سے نفرت ہوگئی اور اس نے اس کی جگہ بھنا ہوا گوشت کھالیا۔ اس سے مرض اور بھی بڑھ گیا۔ اسے بڑھنا ہی چاھئے تھا۔ پرہیز اس کا نام نہیں کہ جب تک طبعیت نے پسند کیا پرہیز کرتے رہے جب جی نہ چاہا اسے چھوڑ دیا۔ یہ روش بڑے نقصان کا موجب ہوتی ہے۔

قران کہتا ہے کہ

ومن الناس من یعبد اللہ علیٰ حرف ۔

ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے احکام کی اطاعت بالکل کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔

فان اصابہ خیرن اطمان بہ ۔

اگر انہیں اس میں فائدہ نظر آئے تو وہ اس سے مطمئن رہتے ہیں۔

وان اصابتہ فتنۃ ن انقلب علیٰ و جھہ ۔

لیکن اگر کوئی مشکل سامنے نظر آئے تو فوراً روگردانی اختیار کرلیتے ہیں۔

اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

خسر الدنیا والآ خرۃ

ان کا حال بھی تباہ ہوتا ہے اور مستقبل بھی تاریک۔

ذالک ھوا لخسران المبین (۲۲/۱۱)

یہ ایک ایسا خسارہ ہے جو کسی دلیل کا محتاج نہیں۔

طلوعِ اسلام کا مسلک اور مقصد

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ....

1. تنہا فکرِ انسانی (عقل) زندگی کے مسائل حل کرنے کے لئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔
2. یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔
3. حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ جو روایات قرآن کے مطابق ہوں گی صحیح ہوں گی جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔
4. حضور نبی کریمؐ انسانی سیرت و کردار کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن عجمی سازشوں نے ہماری تاریخ میں ایسی چیزیں شامل کر رکھی ہیں جن سے حضورؐ کی سیرت داغدار ہو کر سامنے آتی ہے۔ ہماری تاریخ کے ایسے تمام حصے (خواہ وہ کسی کتاب میں ہوں) یکسر غلط اور وضعی ہیں۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔
5. قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس برادری کے قیام کی عملی شکل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔
6. اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ (انہیں قانونِ شریعت کہا جاتا ہے) یہ جزئی قوانین حالات کی تبدیلی سے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔
7. اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو جاتی ہے اور کوئی فردِ معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ (اسے ربوبیتِ عامہ یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش سے تعبیر کیا جاتا ہے)
8. ربوبیتِ عامہ کے مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرے کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ہر ایک کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی رہے اور اس طرح کوئی انسان دوسرے انسان کا محتاج نہ رہے۔ اسے "قرآنی نظامِ ربوبیت" کہا جاتا ہے۔

ہمارا مقصد یہ ہے کہ ....

ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت نافذ ہو جائے تاکہ صفاتِ خداوندی کی روشنی میں ہر انسان کی مضمر صلاحیتیں کامل نشوونما پا سکیں اور سطحِ زمین "اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو اس پیغام کو عام کرنے میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

اس شمارے میں

- مفاہمت کی کوششیں
- ترک اور اسلام
- عربوں کی دفاع
- قومی گیت
- کارکردگی
- مشرقی پاکستان
- مغربی پاکستان
- تاریخی شواھد
- اسلام کی سرگزشت
- مجلس اقبال
- عورت کا قران
- طاہرہ کے نام
- سلطنت اردن
- بزم طلوع اسلام
- نقد و نظر
- حقائق و عبر
- باب المراسلات
- اندرون ہند
- بین الاقوامی جائزہ
- عالم اسلامی

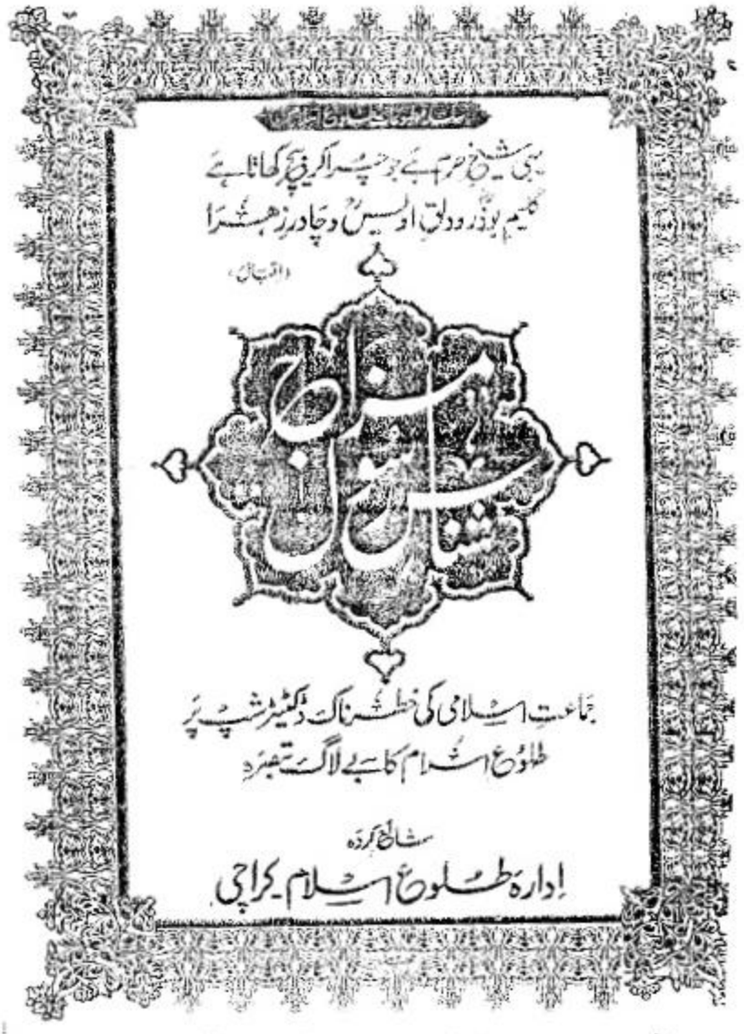

ضخامت ۴۴۸ صفحات - مجلد مع گرد پوش -
قیمت -/۴ روپے علاوہ محصول ڈاک

قیمت -/۸/۱ روپیہ

قیمت -/۲ روپے

ضخامت ۴۰۸ صفحات مجلد مع گردپوش
قیمت ۴/ روپے علاوہ محصول ڈاک

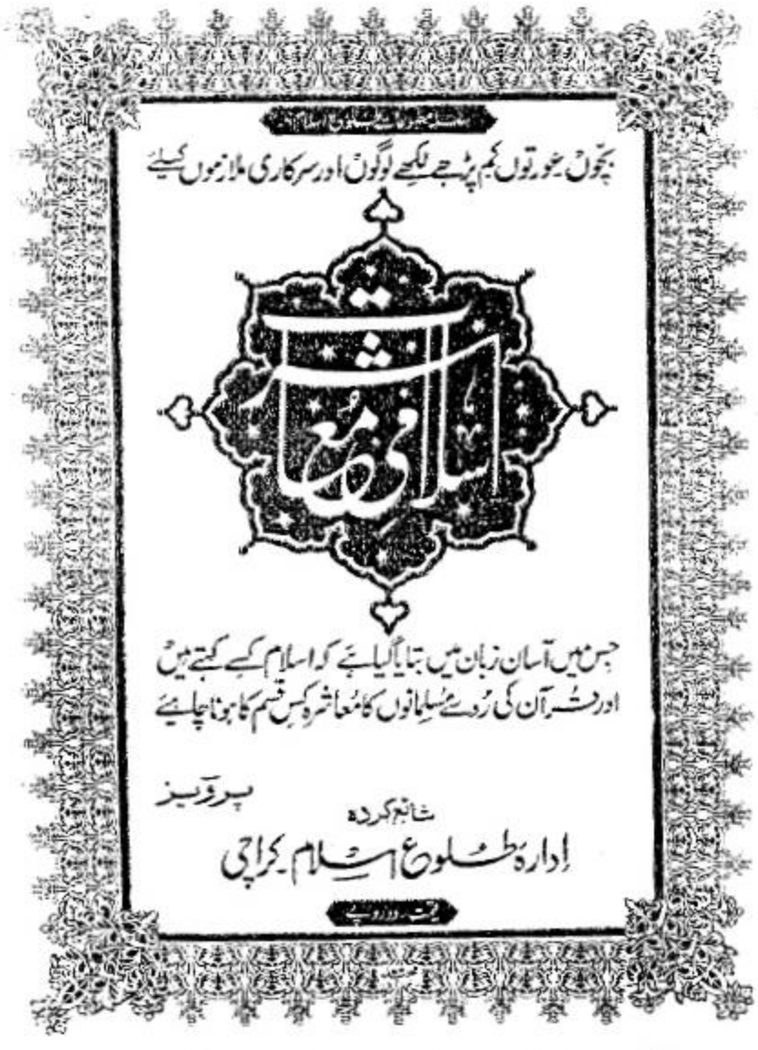

ضخامت ۱۹۲ صفحات مجلد مع گرد پوش
قیمت -/۲ روپے علاوہ محصول ڈاک

ہفت روزہ

طلوعِ اسلام

جلد ۸ | ۱۲ مارچ ۱۹۵۵ء | نمبر ۶

مفاہمت کی کوشش

مولوی تمیز الدین خان کے مقدمہ نے ملک میں جو ناخوشگوار فضا پیدا کر رکھی ہے، کونسا قلب حساس ہے جو اس پر وقفِ اضطراب اور کونسا دیدۂ بینا ہے جو اس پر خوں فشاں نہیں۔ محترم گورنر جنرل کے جرأت مندانہ اقدام نے ملک کی ڈوبتی ہوئی نبضوں کو پھر سے تپش آمادہ بنا دیا تھا۔ لیکن اس مقدمہ نے ارباب حل و عقد کی توجہات کو اپنی طرف الجھا لیا اور ملک کی بہت سی توانائیاں جو تعمیری کاموں میں صرف ہونی چاہیئے تھیں، اس طرح ضائع ہو گئیں (اور ہو رہی ہیں) بارے، ہماری عدالت عالیہ کے چیف جسٹس، محترم محمد منیر صاحب نے انتہائی دانش و تدبر سے کام لے کر ایک ایسی صورت کی طرف راہ نمائی کر دی ہے جس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ قوم اس کشمکش کی مزید ناخوشگواریوں سے بچ جائے گی۔ ہم محترم منیر صاحب کی سلامت روی اور بلند نگہی کے پہلے ہی سے معترف تھے۔ اب ان کے اس بزرگانہ اقدام نے ہمارے دل میں ان کی عزت و احترام کو اور بھی زیادہ کر دیا ہے۔

جس وقت یہ سطور سپرد قلم کی جا رہی ہیں اس وقت تک کی خبر یہی ہے کہ لاہور میں فریقین کی باہمی مفاہمت کے لئے کوشش ہو رہی ہے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جس وقت یہ پرچہ قارئین تک پہنچے گا اس وقت اس معاملہ کی پوزیشن کیا ہوگی۔ اس لئے کہ

مقام پست و شکست و فشار و سوز و کشید

میان قطرۂ نیسان و آتشِ عنبی!

ہمیں خوشی ہوگی اگر یہ تمام مراحل بحسن و خوبی طے ہو جائیں اور حسن کارانہ انداز سے باہمی مفاہمت ہو جائے۔ لیکن جو حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مفاہمت مقصود بالذات ہے اور اس سے قوم کے تمام عقدہ ہائے لاینحل کی کشود ہو جائے گی، وہ ایک غلط فہمی میں مبتلا ہیں اور اسی غلط فہمی کے ازالہ کا جذبہ ہے جو ان سطور کا محرک ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس وقت ہمارا ملک جس افسوسناک حالت تک پہنچ گیا ہے، اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ وہ کونسی چیز ہے جس نے اسی سات آٹھ سال کے عرصہ میں آہستہ آہستہ ملک کی یک جہتی و یک نگہی کو اس تشتت و انتشار میں بدل دیا ہے۔ وہ کونسی مشکل ہے جس کی وجہ سے ہماری مجلس آئین ساز اپنے فرائض کی سر انجام دہی میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ کونسا سنگِ گراں ہے جو اس کی راہ میں اس بری طرح حائل رہا۔ ہماری سیاست کی اصل و بنیاد میں وہ کونسی خرابی کی صورت ہے جس کی وجہ سے اس کے اوپر اٹھائی ہوئی کوئی عمارت تکمیل تک نہ پہنچ سکی؟ اگر ہم شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا کر اپنے آپ کو فریب نفس میں مبتلا رکھنا چاہیں تو ان سوالات کے بہت سے سطحی جواب دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان جوابات سے نہ مرض کی تشخیص ہو سکے گی نہ بیمار کا علاج۔ تشخیص اور کارگر علاج کے لئے ضروری ہے کہ ہم حقائق کو بے نقاب اپنے سامنے رکھیں خواہ ان کا اس طرح بے نقاب سامنے آنا ہم پر کتنا ہی گراں کیوں نہ گزرے۔ حقائق سے جی چرانے کی وجہ سے ہم نے اپنے آپ کو یہاں تک پہنچا دیا ہے اگر ہم ان سے اسی طرح جی چراتے اور آنکھیں بند کرتے رہے تو حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔ ہماری شروع سے یہ کوشش رہی ہے کہ ہم قوم اور ملک کے سامنے حقائق کو بے نقاب پیش کرتے چلے جائیں خواہ اس میں ہمیں کتنا ہی ہدفِ ملامت کیوں نہ بننا پڑے۔

حقیقت یہ ہے (اور ہماری درخواست یہ ہے کہ آپ حقیقت کو، جذبات سے الگ ہٹ کر خالی الذہن ہو کر سنئے) کہ یہ واقعہ ہے کہ ابھی تک مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے باشندے ایک قوم کے فرد نہیں بن سکے۔ ان کے درمیان بڑی گہری خلیج حائل ہے۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ ہندوؤں کو ساتھ ملا کر، مشرقی پاکستان کو آبادی کے لحاظ سے مغربی پاکستان کے مقابلہ میں مستقل اکثریت حاصل ہے۔ اب ذرا اس نقشہ کو سامنے لایئے کہ جب ان حالات میں آپ مشرقی اور مغربی پاکستان کے باشندوں کو آئینی طور پر کسی ایک جگہ اکٹھا کریں گے تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مشرقی پاکستان، بوجہ اپنی کثرتِ تعداد کے بل بوتے پر فیصلہ اپنی مرضی کے مطابق کرتا جائے گا۔ اور مغربی پاکستان والے ان کے ان فیصلوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اس طرح ان دونوں خطوں میں بدظنی اور عدم اعتماد کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی جائے گی۔ یہ تھا وہ نقشہ جو سات سال تک ہماری مجلس دستور ساز میں ہر دیدۂ بینا کے سامنے آتا رہا اور جس نے ملک کو اس الم انگیز حالت تک پہنچا دیا لہٰذا کوئی حل جو اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کر کے کیا گیا در اصل کوئی حل نہیں ہوگا۔ وہ اسی ناکام تجربہ کا دہرانا ہوگا جو اس وقت تک غلط بنیادوں پر کیا جاتا رہا۔ فرض کیجئے کہ موجودہ کشمکش میں فریقین میں مفاہمت ہو جاتی ہے۔ طے یہ ہوتا ہے کہ ایک جدید مجلس آئین ساز کی تشکیل ہو۔ اس کے لئے نئے انیکشن ہوتے ہیں۔ نئے اراکین کا انتخاب ہو جاتا ہے لیکن اس نئی اسمبلی میں پھر ایک خطہ کو مستقل اکثریت حاصل رہتی ہے۔ تو فرمایئے اس تمام تبدیلی سے صورت حالات بہتر کیسے ہو جائے گی؟ اس نئی اسمبلی میں بھی وہی کشاکش رہے گی جس نے پرانی اسمبلی کو اس ندامت آمیز اور ملک کو اس تاسف انگیز حالت تک پہنچا دیا تھا۔ لہٰذا باہمی مفاہمت سے ہو یا عدالت کے فیصلے سے۔ گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی سے ہو یا کسی معجزہ کی رو سے ملک کی حالت اسی صورت میں سدھر سکے گی کہ ملک کے دونوں صوبوں میں یکسانیت اور ہمواری رہے اور ایک خطہ کی دوسرے پر بالادستی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی ممکن العمل صورت یہی ہو سکتی ہے کہ مشرقی پاکستان کو دو برابر کی وحدتیں تسلیم کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مجلس دستور ساز یا مرکزی مجلس قوانین ساز میں جو مسئلہ بھی پیش ہو، جب تک ہر وحدت کے اراکین کی اکثریت (الگ الگ طور پر) اس کے حق میں نہ ہو، اسے منظور نہ کیا جائے۔ مثلاً (فرض کیجئے کہ) نئی مجلس آئین ساز میں مشرقی پاکستان کے ایک سو میں اور مغربی پاکستان کے ایک سو نمائندے شامل ہیں۔ اس اسمبلی میں ایک مسئلہ پیش ہوتا ہے۔ موجودہ حالت میں اگر ان (مجموعی) دو سو میں ممبروں میں سے ایک سو گیارہ کی آرا ایک طرف ہو جائیں تو وہ معاملہ پاس ہو جاتا ہے۔ لیکن ہماری پیش کردہ تجویز کی رو سے جب تک (تنہا) مشرقی پاکستان کے اکیاون ممبر اور اسی طرح (تنہا) مغربی پاکستان کے اکیاون ممبر اس کے حق میں نہ ہوں اسے منظور شدہ نہ سمجھا جائے۔ اس سے کسی وحدت کو دوسری وحدت پر بالادستی کا موقعہ نہیں ملے گا۔ نہ ہی کسی وحدت کے دل میں یہ شبہ گزرے گا کہ دوسری وحدت نے ہمارے مفاد کے خلاف، اپنی اکثریت کی بنا پر یہ فیصلہ کر دیا ہے۔

مجلس آئین ساز سے آگے بڑھ کر جب معاملہ مرکزی حکومت تک آئے تو وہاں بھی یہی شکل ہونی چاہیئے۔ یعنی ہونا یہ چاہیئے کہ دونوں وحدتیں اپنی اپنی جگہ آزاد ہوں لیکن وہ مشترکہ امور (مثلاً دفاع امور خارجہ وغیرہ) کو بطیب خاطر مرکز کی تحویل میں دیدیں۔ ان امور کے متعلق مرکزی قوانین مرتب

کرنے میں بھی وہی طریق اختیار کیا جائے جس کی طرف (مجلس آئین ساز کے ضمن میں) اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی جب تک اسے ہر وحدت کے نمائندوں کی جداگانہ تائید حاصل نہ ہو، اسے منظور شدہ نہ سمجھا جائے۔ یہ وہ انداز حکومت ہے جسے عام طور پر کانفیڈریسی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس انداز حکومت کے لئے یہ ضروری ہے کہ مغربی پاکستان بھی مشرقی پاکستان کی طرح ایک ہی یونٹ ہو۔ لہذا موجودہ کشمکش میں باہمی مفاہمت کی کوئی بھی شکل اختیار کی جائے، اس سے مغربی پاکستان کے ایک وحدت بننے کا مسئلہ کسی طرح بھی متاثر نہیں ہونا چاہیئے اس کے متعلق جو فیصلہ ہو چکا ہے وہ بہر حال و بہر کیف علیٰ حالہ رہنا چاہیئے

یہ ہے وہ بنیادی ڈھانچہ جس کے مطابق ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان اس دلدل سے بھی نکل سکتا ہے جس میں ہم اس وقت بُری طرح پھنس رہے ہیں۔ اور اس کے بعد اس کا ہر قدم آگے بھی بڑھ سکتا ہے۔ ہم پھر دُہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ موجودہ کشمکش کا فیصلہ کن شرائط پر ہوتا ہے۔ کس کی سچی عزت بچتی ہے اور کس کی جھوٹی عزت جاتی ہے۔ کون اپنے آپ کو فاتح و منصور سمجھتا ہے اور کون خاسر و ناکام۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مملکت کے مستقبل کا ڈھانچہ ان خطوط کے مطابق تیار ہو جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ جس نے بھی یہ کچھ کر دیا وہ ہمارے ہدیہ تبریک و تہنیت کا سزاوار اور آنے والی نسلوں کی دعاؤں کا مستحق۔ دفاع اس لئے کہ وہی پاکستان کا سچا دوست اور اس کا حقیقی بہی خواہ ہوگا۔ اگر یہ ہو گیا تو مفاہمت کی کوشش کے لئے عرق ریزیاں، یا عدالت کے فیصلہ کے لئے دماغ سوزیاں، سب درخور حمد و ستائش ہوں گی اور مثمر اقبال اور اگر یہ نہ ہوا تو یہ تمام تگ و تاز اور جدوجہد نہ صرف سعی لاحاصل ہوگی بلکہ منتج ادبار۔ اس لئے کہ یہ سب کچھ ایک وقت کے بعد، محض تاریخ کی داستان بن جائے گا اور باقی پاکستان رہ جائے گا اور زندۂ جاوید وہی کہلا سکے گا جو پاکستان کے استحکام و ارتقاء کے لئے کچھ کر جائے گا۔

من و دل گر فنا شدیم چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

ترک اور اسلام

جب مصطفےٰ کمال نے مُلّا کے پیش کردہ مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کا اعلان کیا تو چاروں طرف سے شور اٹھایا گیا تھا کہ ترکوں نے اسلام کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ ان طوفان برپا کرنے والوں میں مختلف ممالک کے مُلّا پیش پیش تھے اور ان کے پیچھے درحقیقت مغرب کی وہ قوتیں تھیں جو "ترکی کی لاش" میں از سر نو زندگی کے آثار دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ جو لوگ ترک قوم کے نفسیات سے واقف تھے وہ اسے باور کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہو سکتے تھے کہ ترک اسلام کو چھوڑ سکتے ہیں۔ لیکن مُلّاؤں نے اس شور کو برابر جاری رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترکوں نے اپنے معاشرہ سے مُلّا کے وجود کو نکال باہر کیا تھا۔ اور چونکہ گذشتہ ہزار سال میں یہ بلا واقعہ تھا کہ کسی مملکت میں مُلّا کا اقتدار یوں ختم ہو گیا ہو، اس لئے مُلّا کی یہ چیخ و پکار قابلِ فہم تھی۔

اس حقیقت کے ثبوت تو بار ہا ملتے رہے کہ ترکوں کے دل کی گہرائیوں میں اسلام کی کس قدر محبت ہے، لیکن محترم جلال بایار نے ۲۰ فروری کو کراچی یونیورسٹی میں جو تقریر کی اس سے یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اسلام کی عظمت و عقیدت کا چشمہ کس جوش مسرت سے ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبلا چلا آرہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام ایک ترقی پذیر مذہب ہے اور انسانیت و تہذیب کا علمبردار۔ جس کے پیرو مہذب دنیا سے کٹ کر کبھی جامد زندگی بسر نہیں کر سکتے کیونکہ اس کی اساس علم و حکمت پر ہے۔ انہوں نے مسلمانوں سے تاکیداً کہا کہ انہیں علم و حکمت کا متلاشی رہنا چاہیئے خواہ وہ دنیا کے انتہائی کونوں میں کیوں نہ ملیں اپنی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر مسلمان متمدن دنیا میں قابلِ عزت مقام حاصل کر سکتے ہیں۔

سوچئے کہ جس قوم کا نمائندہ اسلام کے متعلق یہ خیالات رکھتا ہو اس قوم کے متعلق یہ وہم بھی گزر سکتا ہے کہ اس نے اسلام کو چھوڑ دیا ہے؟ جیسا کہ ہم کئی بار لکھ چکے ہیں، ترکوں نے درحقیقت اس زنجیر کو توڑا تھا جس میں مُلّا نے مذہب کے نام پر صدیوں سے اس قوم کو جکڑ رکھا تھا۔ یہ زنجیر ہے ہی اس قابل کہ اس سے جس قدر جلد ہو سکے گلو خلاصی کرائی جائے۔ ایک ترکوں پر ہی کیا موقوف ہے، جس جس قوم کو بھی ہوش آتا گیا وہ مُلّا کے پنجے سے نکلنے کی اسی طرح کوشش کرے گی۔ اگر اس ملک میں ایسے وقت میں کوئی ایسا ہوا جو اُس مُلّا کے انسانیت کش مذہب کی جگہ قرآن کا انسانیت ساز دین دیدے تو وہ اسے سر آنکھوں سے لگائے گا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا تو وہ مُلّا کے مذہب کو مسجد کی چار دیواری میں مقفل کر کے دنیا کے معاملات دُنیاوی طریق سے حل کرنے کی کوشش کرے گا چونکہ اس طرح مُلّا کے ہاتھوں سے اس کا اقتدار چھن جاتا ہے اس لئے وہ اس قسم کی ہر کوشش کی مخالفت کرے گا، جس طرح پاکستان میں جماعت اسلامی کر رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محترم جلال بایار کی آمد پر اس جماعت کے مُنہ سے "خوش آمدید" کا ایک لفظ تک بھی نہ نکل سکا۔ ہم اسلام کے ان سب سے بڑے اجارہ داروں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ کر کے تُرک اس قابل نہیں رہے کہ ان سے علیک سلیک بھی روا رکھی جائے تو اس جماعت اسلامی کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے جسے آپ ہندوستان چھوڑ آئے ہیں اور جس نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ ایک مذہبی جماعت ہے اسے سیاست سے کچھ تعلق نہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اسی سیکولر حکومت کے ماتحت زندگی بسر کر رہے ہیں جس نے مذہب کو یکسر سیاست سے الگ کر رکھا ہے اور ان قوانین کی اطاعت کر رہے ہیں جنہیں شریعت سے کوئی واسطہ نہیں ان کے خلاف تو اُن کی زبان سے ایک حرف تک نہیں نکلتا (اس لئے کہ وہ جماعت اسلامی کے ارکان ہیں) لیکن ترکوں کے خلاف ان کی "صالحیت" کی ایک ایک رگ پھڑک اٹھتی ہے! توبہ۔ توبہ۔ کس قدر نفرت ہے اس جماعت کو اپنے فرقہ کے علاوہ دنیا کے ہر مسلمان سے!

عربوں کی دفاع

مصر نے شام سے ایک معاہدہ کر کے نئے عربی دفاعی سلسلہ کی طرح ڈال دی ہے ابھی اس معاہدہ کی تفاصیل شائع نہیں ہوئیں، لیکن جس پس منظر میں یہ معاہدہ ہوا ہے اور جو اطلاعات اس سے متعلق آرہی ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ مصر کے عزائم کیا ہیں اور مصر کن اوچھے ہتھیاروں سے اپنے مقاصد مشومہ کی تکمیل کر رہا ہے۔ کہا گیا ہے کہ دونوں ممالک ایک ہی فوجی مرکز بنائیں گے، ان کے سفارتی نمائندے ایک ہوں گے، خارجہ حکمت عملی مشترک ہوگی، سکہ ایک ہوگا، وہ غیر ملکی اتحادوں میں شریک نہیں ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس میں وحدت و تعاون کا جو خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ ملمع ہے اس ایک شق پر جس کا صاف طور پر مطلب یہ ہے کہ شام، ترکی عراقی معاہدے میں شریک نہیں ہوگا۔ مصر نے شام کو اس معاہدے میں کیسے شریک کیا؟ اس کا جواب وزیر اعظم ترکی عدنان مندریز کے تازہ بیان میں ملتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ترکی اور عراق کی دوستی کے باوجود مصر ان کی طرف برافروختگی اور تشدد کی پالیسی اختیار کرتا جا رہا ہے، وہ دوسرے ممالک (شام وغیرہ) پر دباؤ ڈال رہا ہے اور ان کی آزادی تک کا لحاظ نہیں کرتا۔ یہ دباؤ شام میں اس لئے کامیاب ہوا کہ وہاں کی موجودہ حکومت غیر متوازن ہے۔ گذشتہ سال ستمبر میں شامی انتخابات منعقد ہوئے لیکن ان میں کوئی ایک پارٹی بھی اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ اس کے ساتھ ایک کمیونسٹ امیدوار کامیاب ہو گیا۔ متعدد کامیاب ارکان اشتراکی نہیں تو اشتراکیت سے مشابہ خیالات ضرور رکھتے ہیں۔ ان انتخابات کے بعد فارس الخوری نے حکومت مرتب کی لیکن مصر کو ان کی بین بین کی پالیسی پسند نہ آئی اور ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ بالآخر انہوں نے ۷ فروری کو استعفیٰ دے دیا۔ نئی مخلوط حکومت اصالی کی قیادت میں بنی ہے لیکن وہ بھی ڈانواڈول ہے اور اشتراکی ممبروں کے ووٹ کی محتاج ہے اس احتیاج نے اسے غیر جانبداری کی طرف مائل کر دیا ہے۔ مصر دباؤ ڈال کر ایسی کمزور حکومت سے اپنی بات ضرور منوا سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی حکومت کتنی دیر برقرار رہ سکتی ہے اور اس کا کوئی فیصلہ کیسے ملک کا عمومی فیصلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مزید برآں شام کی کوئی قابل ذکر منظم اور مسلح سپاہ نہیں۔ وہ اور مصر مشترکہ کمان بنا بھی لیں گے تو آخر فوج کہاں سے آئے گی، اسے مسلح کیسے کیا جا سکے گا اور آئندہ اسلحہ کی فراہمی کیسے ہوگی؟ ان حالات میں شام کے اتحاد سے نہ مصر کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ خود شام کو۔ لیکن مصر کو فائدے سے سروکار نہیں۔ وہ ممالک عربیہ کی قیادت کا خواب دیکھ رہا ہے اور جائز و ناجائز ذرائع سے اپنے ہمسایوں کو اپنا دست نگر بنانا چاہتا ہے۔ یہ کوشش انتہائی مذموم ہے۔ مقام مسرت ہے کہ کم از کم عراق نے مصری دباؤ کو ٹھکرا دیا ہے اور اس نے ترکی سے معاہدہ کر کے پاکستان سے معاہدہ کرنے کی طرح ڈال دی ہے۔ مصر عراق کو اس گستاخی کی سزا دینا چاہتا ہے اور ترکی اور پاکستان کی ہر اس کوشش کو ناکام بنانا چاہتا ہے جو وہ اتحاد عالم اسلامی کے لئے کر رہے ہیں۔ یہ ایک

المناک داستان ہے اور تفصیلی تبصرے کی محتاج۔ ہم انشاء اللہ اولیں فرصت میں ادھر توجہ دیں گے۔ فی الحال ہم مصر کو مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ وہ یہودیوں کی تازہ جارحیت سے سبق حاصل کرے۔ یہودی جانتے ہیں کہ عرب آپس میں بٹے ہوئے بھی ہیں اور کمزور بھی ہیں۔ وہ مصر کی داخلی کمزوری کو بھی خوب جانتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مصر کو خصوصی نشانہ بنایا ہے۔ مصر کو اس سے سبق حاصل کر کے ان ممالک کا ساتھ دینا چاہیے جو عالم اسلامی کو بالعموم اور عالم عرب کو بالخصوص متحد و مستحکم بنا رہے ہیں۔ یہودی جارحیت کا جواب اسی اتحاد و استحکام میں ہے۔

قومی گیت

معاصر "ٹائمز آف کراچی" اس خبر کا ذمہ دار ہے کہ مرکزی وزارتِ اطلاعات کو ۲۸ فروری کی آخری تاریخ تک ایک سو قومی گیت موصول ہوئے ہیں۔ اب مذکورہ وزارت ان میں سے اپنی پسند کے گیت چھانٹے گی اور پھر مرکزی کابینہ آخری فیصلہ صادر کرے گی۔ قطع نظر اس بحث کے کہ قومی ترانے کے بعد قومی گیت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ہم دو ایک گزارشات حکومت کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

خبر میں بتایا گیا ہے کہ قومی گیت کے بارے میں قومی ترانے کا سا طریق اختیار نہیں کیا جائے گا۔ یعنی یہ کہ سُر پہلے بنالی جائے اور ترانہ بعد میں اس کے مطابق ڈھالا جائے۔ قومی ترانے کے ساتھ سات سال تک جو مذاق ہوتا رہا وہ عام طور پر معلوم ہے۔ اور جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ محض اتفاق کی بات نہیں تھی کہ سُر پہلے بن گئی تھی اور ترانے کے الفاظ بعد میں موزوں کئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ترانہ کمیٹی کے ارکان میں اس حد تک جوتیوں میں دال بٹتی رہی کہ اول تو سات سال تک فیصلہ نہ ہو سکا اور جب فیصلہ ہوا تو سُر پہلے بنانا پڑی اور الفاظ بعد میں ڈھالنا پڑے، گویا سُر اور الفاظ کا رشتہ علتِ مرض نہیں علامتِ مرض ہے۔ اور ظاہر ہے کہ علامت کے علاج سے علت رفع نہیں ہو جاتی۔ لہٰذا اگر حکومت کو قومی ترانے کے تجربے سے فائدہ اٹھانا ہے تو اس کا یہ طریقہ نہیں کہ سُر پہلے نہ بننے دی جائے بلکہ جو کارروائی بھی کی جائے وہ ظاہر و باہر ہو تاکہ اندر اندر پھر وہی صورت حال پیدا نہ ہو سکے جو قومی ترانے کے سلسلے میں پیدا ہو گئی تھی۔ ہم حکومت کو مشورہ دیتے ہیں کہ جتنے قومی گیت موصول ہوئے ہیں انہیں شائع کر دیا جائے اور ملک کو موقع دیا جائے کہ ان کے حسن و قبح پر بحث کر سکے۔ اس سے حکومت کو فیصلہ کرنے میں مدد بھی ملے گی اور جو فیصلہ ہوگا اسے قبولیت عامہ کی سند بھی حاصل ہوگی۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں ڈر ہے کہ جو کچھ قومی ترانے کے سلسلے میں ہوا تھا وہی کچھ اب ہوگا اور پاکستان پر جگ ہنسائی کا ایک اور موقع پیدا ہو جائیگا۔

اس سلسلے میں ہم دوسری گزارش یہ کرنا چاہتے ہیں کہ خبروں میں بتایا گیا ہے کہ موصول گیتوں میں کوئی ۳۵ بنگلہ زبان میں ہیں۔ اور بعض حلقوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ چونکہ قومی ترانہ اُردو میں ہے اس لئے قومی گیت بنگالی میں ہونا چاہیئے۔ وزیراعظم نے جب شاعرانِ ملک کو قومی گیت لکھنے کی دعوت دی تھی تو اس میں بتایا گیا تھا کہ گیت ایسا ہونا چاہیئے جسے عام تقریبات میں بے تکلفی سے گایا جا سکے۔ اگر مقصد یہی ہے تو گیت صرف اردو زبان میں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مغربی پاکستان میں بنگالی گیت سمجھنے والا شاید ہی کوئی مل سکے گا۔ لیکن مشرقی پاکستان میں عام طور پر اردو گیت سمجھا اور گایا جا سکے گا۔ حکومت کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ معاملہ دونوں حصص ملک میں "مساوات" کا نہیں بلکہ حقائق و شواہد کا ہے اور ان کا تقاضا یہی ہے کہ صرف اردو کو اختیار کیا جائے اور قومی گیت اسی ایک زبان میں بنایا جائے۔

کارکردگی

کراچی میں کھیلوں کے لئے ایک شایانِ شان قومی سٹیڈیم کی ضرورت تقسیم کے کچھ عرصہ بعد ہی محسوس ہونا شروع ہو گئی تھی۔ لیکن جیسا کہ ہمارے ہاں عموماً ہوتا ہے برسوں تک اس کے منصوبے تیار ہوتے رہے۔ اب حال ہی میں کرکٹ کا ٹیسٹ میچ سر پر آ گیا۔ چنانچہ دیکھتے دیکھتے کرکٹ سٹیڈیم تیار ہو گیا۔ اس کارنامہ پر بڑے فخر کا اظہار کیا جا رہا ہے، اور دیکھا جائے تو بات ہے بھی فخر کی۔ ۱۷۶ ایکڑ زمین پر پچاس ہزار تماشائیوں کے بیٹھ کر کرکٹ دیکھنے کا انتظام کھیل نہیں تھا۔ اس پر ۲۲ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ اور دن رات کام کیا گیا۔

اس کارکردگی کا مقابلہ سابقہ بے عملی سے کیا جائے تو بے اختیار کہنا پڑے گا کہ مشکلات راہ نہ تو پیسے کی کمی کی وجہ سے تھیں نہ وہ تعمیری مسالے کی نایابی سے متعلق دشواریوں سے عبارت تھیں کیونکہ یہ اور دیگر وسائل سب موجود تھے۔ گویا بے عملی کا سبب وسائل کی کمی نہیں بلکہ سرے سے کام کرنے کے عزم ہی کا فقدان تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جو وسائل اب میسر آ گئے وہ پہلے ہی موجود تھے اور جو کام اب ہوا وہ پہلے ہو سکتا تھا۔ اس نکتہ کو سمجھ لیا جائے تو مہاجرین کی بحالی کا مسئلہ ایسا لاینحل نہیں رہتا جیسا کہ وہ سمجھا جاتا ہے۔ کراچی میں لاکھوں بے خانماں ہیں۔ ان کی بحالی کے لئے ایک پوری وزارت موجود ہے اور وہ طرح طرح کے ٹیکس وصول کرتی ہے اور آئے دن لمبے چوڑے بیانات شائع ہوتے ہیں؛ لیکن جب کام کا وقت آتا ہے تو مشکلات گنوا گنوا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ پیسے، مسالے، وسائل وغیرہ کی کمی اتنی ہے کہ کچھ کیا نہیں جا سکتا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو کچھ کھیل کے میدان میں دنوں میں کر دکھایا گیا وہ برسوں میں مہاجرین کی بحالی کے لئے کیوں نہیں کیا جا سکا؟ اور اگر اب بھی اس کام کے کرنے کا تہیہ کر لیا جائے تو کیا وجہ ہے کہ کچھ کام نہ ہو سکے اور مہاجرین کے رہنے کے لئے معمولی مکانات بھی تعمیر نہ ہو سکیں؟ کیا یہ اساسی انسانی مسئلہ اس قابل نہیں کہ اس میں، کم از کم اتنی ہی دلچسپی لی جائے جتنی کرکٹ کے کھیل میں لی جاتی ہے؟ سٹیڈیم کی تعمیر کے کارنامہ پر فخر کرنے والے سوچیں اور جواب دیں۔

عالم اسلامی

عالم اسلامی دو متضاد تحریکوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ ایک تحریکِ اتحاد ہے جس کے علمبردار ترکی، پاکستان اور عراق ہیں اور دوسری تحریکِ افتراق ہے جس کا سرخیل مصر بہ تائید سعودی عربیہ ہے۔ یہ دونوں تحریکیں پہلے سے کہیں زیادہ سرگرم ہو گئی ہیں جس سے عالم اسلامی ایک نئی کشمکش میں مبتلا ہو گیا ہے۔

مساعی اتحاد اب فیصلہ کن مرحلہ پر پہنچ گئی ہیں۔ وہ مصر کے روکے سے رکتی نہیں جائیں گی لیکن انہیں کامیابی کے لئے مسلسل جدوجہد کرنا ہوگی۔ تازہ اطلاعات سے مترشح ہوتا ہے کہ ترکی، پاکستان اور عراق کے اتحاد کو باقاعدہ طور پر مغرب سے منسلک کر کے اسے مشرق وسطیٰ کے دفاع کی باقاعدہ شکل دینے کی تیاریاں شروع ہو چکی ہیں۔ اور بہت جلد کسی نتیجہ کا اعلان ہو جائے گا۔ سر انتھنی ایڈن برطانوی وزیر خارجہ جو بنکاک کانفرنس کے سلسلہ میں ایشیا آئے تھے آتے جاتے قاہرہ، بغداد، بیروت اور کراچی میں اہم سیاسی مذاکرات کئے۔ انھوں نے جہاں مصر کو مشرق وسطیٰ کے مشترکہ دفاع پر آمادہ کرنے کی کوشش کی وہاں برطانیہ کے اس تنظیم میں شامل ہونے کا بھی جائزہ لیا۔ اب ایڈن ترکی وزیر اعظم عدنان مندریز سے ۱۶ مارچ کو ملاقات کر رہے ہیں۔ اس ملاقات میں مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کا خاکہ تیار ہونے کی توقع ہے اس میں ابتداً ترکی، پاکستان، عراق، اور برطانیہ شریک ہوں گے۔ ایران اور دیگر ممالک اسلامیہ کے بعد میں آنے کی امید ہے۔ مصر نے بھی اپنی مساعی تفریق کو تیز تر کر دیا ہے۔ اسے جنوری میں عرب وزرائے اعظم کی کانفرنس میں جس ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اس سے وہ بہت پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اب وہ عرب لیگ کو بالائے طاق رکھ کر دوسرے حربوں پر اتر آیا ہے۔ مصری وزیر صلاح سالم، عراق کے علاوہ عربی ممالک کا دورہ کر رہے ہیں اور بعض اپنے ساتھ ملا رہے ہیں۔ ساری پروپیگنڈہ مشینری جائز و ناجائز ذرائع سے ان کے لئے فضا سازگار کر رہی ہے۔ غیر مستحکم و غیر شوری شامی حکومت پر دباؤ ڈال کر مصر نے ایک عربی دفاعی "اتحاد" قائم کرنے کے لئے معاہدہ کر لیا ہے۔ سعودی عربیہ بھی اس میں شریک ہو گیا ہے۔ تینوں ممالک نے مشترکہ طور پر اعلان کیا ہے کہ وہ ترکی، عراق معاہدے میں شریک نہیں ہوں گے اور حملوں سے بچاؤ کے لئے اپنی افواج کی مشترکہ کمان بنائیں گے۔ یہ تجاویز اردن کو بھی پیش کی گئی ہیں لیکن اس کی شرکت یقینی نظر نہیں آتی۔

ان دنوں اسرائیل نے [illegible] مصر کے مقبوضہ فلسطینی علاقے غازا میں جو جارحیت کا مظاہرہ کیا ہے اس سے عربوں کی اساسی کمزوری اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ مصر اس فتنے کو بھی اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کر رہا ہے اور عربی وحدت پر زور دے رہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عرب متحد ہو کر بھی کیا کر لیں گے۔ یہی بے سر و سامان اور آپس میں بٹے ہوئے عرب ۱۹۴۸ء میں یہودیوں کے خلاف لڑے تھے اس کا نتیجہ نکلا کہ اقوام متحدہ نے اپنی طرف سے جتنے علاقے یہودیوں کو دیئے تھے اس سے کہیں زیادہ انھوں نے لڑ کر ہتھیا لئے۔ عربی ممالک کے اتحاد کا نعرہ خالص نسل پرستی پر مبنی ہے جو دورِ جاہلیت کی یادگار ہے۔ ؎

نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی ۔ اڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہگذر

مشرقی پاکستان

پچھلے ہفتہ لکھا جاچکا ہے کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے رجسٹرار نے غیر حاضر ہونے والے طلباء کو وارننگ دی تھی کہ اگر وہ ۵ مارچ تک اپنے اپنے درجوں میں حاضر نہیں ہوئے تو ان کا نام خارج کر دیا جائیگا۔ اور انہیں ٹرانسفر سرٹیفکیٹ بھی نہیں دیئے جائیں گے۔ رجسٹرار صاحب کی اس دھمکی کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ چنانچہ تازہ ترین اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ تمام لڑکوں نے یونیورسٹی میں حاضری دینی شروع کر دی ہے۔ پچھلے دنوں یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے جس مداہنت اور نرمی کو روا رکھا تھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلباء شیر ہو گئے تھے۔ گذشتہ سال بعض طالب علموں کو سرزنش کے طور پر یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا جس کے بعد یونیورسٹی میں ایک عام ہڑتال کر دی گئی تھی۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے لڑکوں کی ہڑتال سے ڈر کر خارج شدہ لڑکوں کو پھر سے واپس لے لیا تھا۔ اسی طرح یونیورسٹی کورٹ نے ایک قانون بنایا تھا جس کی رو سے یونیورسٹی کے کسی طالب علم یا استاد کے لئے عملی سیاست میں حصہ لینا جرم قرار دیا گیا تھا۔ اس قانون کو طلباء نے "کالے قانون" کا نام دے کر دوبارہ ہڑتال کر دی اور یونیورسٹی والوں نے اس قانون کو واپس لے لیا تھا۔ اس وقت صوبے میں پارلیمانی حکومت قائم تھی اس لئے اسے طلباء کے سامنے جھکنا پڑا تھا اب اس وقت وہاں دفعہ ۹۲ الف قائم ہے جس کی وجہ سے اس مرتبہ طلباء کو جھکنا پڑا۔ ورنہ آٹھ سال میں طلباء کی ذہنی اور دماغی تربیت کی طرف سے بے توجہی برتی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر روز ہنگامے اور ہڑتالیں ہوتی رہتی ہیں۔

وزیر اعظم نے اپنی ماہانہ نشری تقریر میں یہ اعلان کر دیا کہ متحدہ محاذ والے آپس میں لڑ رہے ہیں اس لئے وہاں فوری طور سے پارلیمانی حکومت بحال نہیں کی جاسکتی۔ مشرقی پاکستان میں وزیر اعظم کے اس اعلان کو عام طور پر پسند نہیں کیا گیا۔ چنانچہ متحدہ محاذ کی دونوں پارٹیاں وزیر اعظم کے اس بیان کو عذر لنگ قرار دے رہی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ دونوں پارٹیاں بدستور باہم دست و گریبان ہیں۔ چند دن ہوئے فضل الحق صاحب نے اپنے حامیوں کے دستخط شائع کر دیئے تھے، اب عوامی لیگ والوں نے بھی اپنے حمایتیوں کے دستخط شائع کر دیئے ہیں اس پر بعض دستخط کرنے والوں نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ ہم نے کسی پارٹی کی حمایت میں دستخط نہیں کئے بلکہ محض جلسہ میں حاضر ہونے والوں کی حیثیت سے دستخط کئے تھے۔ اب خبریں آرہی ہیں کہ وزیر اعظم محمد علی بہت جلد مشرقی پاکستان جا رہے ہیں جہاں وہ صورت حال کا پھر جائزہ لیں گے اور کوئی آخری اعلان کریں گے۔ مشرقی پاکستان میں اس وقت ایک افواہ یہ بھی گشت لگا رہی ہے کہ وزیر اعظم کے وہاں جانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ فضل الحق صاحب کی پارٹی کے ایک اہم رکن اور مرکزی وزیر مسٹر ابو حسین سرکار کی قیادت میں مشرقی پاکستان میں پارلیمانی حکومت قائم کر دیں گے۔ متحدہ محاذ کے بعض ذمہ داروں کا یہ خیال ہے کہ یہ افواہ اس لئے مشہور کی گئی ہے تاکہ متحدہ محاذ کے درمیان اختلافات کی خلیج اور زیادہ وسیع ہو جائے اس قسم کی افواہ کے باوجود ایک حلقے کا یہ خیال ہے کہ اس مرتبہ وزیر اعظم پارلیمانی اختیار کا اعلان ضرور کر دیں گے، یہ دیکھنا ہے کہ وزارت عظمیٰ کا تاج کس کے سر پر رکھا جاتا ہے۔ فضل الحق صاحب کے سر پر یا عطاء الرحمان کے سر پر یا ابو حسین سرکار کے سر پر۔ نیز یہ کہ نئی حکومت صوبے میں کیا کرے گی اور ملکی معاملات میں کیا روش اختیار کرے گی۔

مشرقی پاکستان میں مہاجروں کی کل تعداد تقریباً چالیس لاکھ ہے جن کی مادری زبان اردو ہے اس طرح صوبے کے کئی اضلاع ایسے ہیں جہاں گھروں میں اردو بولنے اور اردو لکھنے پڑھنے کا رواج ہے لیکن یہ کس قدر تعجب انگیز امر ہے کہ پورے صوبے میں اردو کا ایک مستقل اسکول ہے۔ اور ایک اسکول میں بنگلہ کے ساتھ ساتھ اردو داں بچوں کی تعلیم کا بھی انتظام ہے۔ ڈھاکہ میں ایک بنگلہ اسکول میں اردو داں بچیوں کے لئے شعبہ اردو کھول کر حکومت مطمئن سی ہو گئی ہے۔ مشرقی پاکستان سے آنے والی خبروں سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں کے لاکھوں اردو داں والدین اور سرپرست اپنے بچوں اور بچیوں کی تعلیم کی طرف سے بے حد فکرمند ہیں۔ کیا حکومت اس اہم کام کی طرف بھی اپنی توجہ مبذول کرے گی؟

مغربی پاکستان

جونہی انتظامی کونسل نے اپنی رپورٹ مکمل کر کے گورنر جنرل کے پیش کی بعض حلقوں کی طرف سے اس کی منظوری اور نفاذ کو ملتوی کرانے کے لئے مذموم کوشش شروع ہو گئی۔ مثلاً یہ کہا گیا کہ ارکان کونسل کے مابین شدید اختلافات ہیں۔ نیز یہ کہ وحدت مغرب میں دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ اور مخالفت کے ڈر سے صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس بھی طلب نہیں کئے جارہے۔

یہ ایک طرح کی اعصابی جنگ تھی جو اس طبقہ کی طرف سے شروع کر دی گئی جسے پہلے مشرقی پاکستان میں رسوائن شکست سے ہمکنار ہونا پڑا۔ اور بعد میں مرکز سے بیک بینی و دو گوش نکلنا پڑا۔ اس شکست خوردہ راندہ طبقے کے حوصلے ایک حد تک سندھ چیف کورٹ کے فیصلے سے بڑھ گئے ہیں۔ یہ فیصلہ اپنی جگہ بجا لیکن اس کا تعلق گورنر جنرل کے خصوصی اختیارات کے استعمال سے ہے اور یہ وہیں تک محدود ہے۔ اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ ملک کی وحدت اور استحکام کے لئے جو کچھ کیا جا رہا ہے یا کیا جائے گا اسے کوئی بدخواہ روک سکے گا۔ کوئی عدالت اور کوئی قانون کسی کو بھی یہ حق نہیں دے سکتا۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے محولہ بالا خبر بالکل بے بنیاد تھی۔ چنانچہ دوسرے ہی دن میاں مشتاق احمد گورمانی نے اس کی تردید کر دی۔ انھوں نے بجا طور پر فرمایا کہ اگر ارکان کونسل متفق الخیال نہ ہوتے تو وہ مقررہ میعاد سے ایک ماہ قبل اپنی رپورٹ مکمل نہ کر سکتے۔ انھوں نے اس کی بھی تردید کی کہ وحدت کی مخالفت کے ڈر سے اسمبلیوں کے اجلاس بلائے نہیں جا رہے اس ڈر کا کوئی موقع ہی نہیں۔ کیونکہ سندھ، سرحد، پنجاب کی اسمبلیوں نے تو اس کے حق میں قرار دادیں منظور کر رکھی ہیں۔ مزید برآں پنجاب اور سرحد کی اسمبلیوں کے اجلاس کی تاریخیں مقرر ہو چکی تھیں۔ (پنجاب اسمبلی کا اجلاس شروع بھی ہو گیا ہے) اس بروقت تردید سے یہ فتنہ فی الحال کم از کم ختم ہو گیا لیکن اسے پورے طور پر ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کونسل کی رپورٹ کو جلد از جلد منظور کر کے نافذ کر دیا جائے۔ وحدت مغرب پر سارے ملک کا اتفاق ہے لہٰذا اسے فی الفور معرض عمل میں لے آنا چاہیئے۔ (مزید اہمیت سے متعلق لمعات ملاحظہ کیجئے)۔

بنکاک میں سیٹو کونسل کے اجلاس میں وزیر اعظم محمد علی صاحب نے پسماندہ ایشیائی ملکوں کی معاشی امداد پر جو زور دیا تھا اس سلسلہ میں پاکستان سے متعلق مزید مذاکرات کراچی میں ہوئے۔ امریکہ کے بیرونی امداد کے مہتمم مسٹر سٹیسن جو مسٹر ڈلیز کے ساتھ بنکاک کانفرنس میں بھی شریک تھے واپس جاتے ہوئے دو دن کے لئے کراچی ٹھہرے۔ ان کا مقصد پاکستان کی معاشی ترقی اور مزید امریکی امداد کا جائزہ لینا تھا۔ ایک دن کے قیام کے بعد انھوں نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ ۱۹۵۶ء میں جن ممالک کو مالی مدد دے گا ان میں پاکستان کا مقام خصوصیت سے نمایاں ہے کیونکہ پاکستان نے معاشی مدد سے فائدہ اٹھایا ہے اور کافی ترقی کر لی ہے۔ اس امداد کا اندازہ یکم جولائی کے بعد ہو سکے گا۔ کیونکہ امریکہ کا مالی سال جولائی سے شروع ہوتا ہے۔ اب تک جو مدد پاکستان کو ملی ہے وہ ۳۰ جون تک کے لئے ہے۔

مسٹر سٹیسن نے ان کارروائیوں کا بھی جائزہ لیا ہے جو ۳۰ جون تک کی مدد کے سلسلہ میں طے ہو رہی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اب تمام کارروائی مکمل ہو چکی ہے اور مطلوبہ سامان ایک سے تین ماہ کے عرصے میں یہاں پہنچ جائے گا۔ امریکی مدد اور ملکی مصنوعات بڑھ جانے سے پاکستان کے سامنے یہ سوال آگیا ہے کہ درآمد کی بجائے برآمد پر توجہ صرف کی جائے۔ اب تک صرف خام مال ہی برآمد ہوتا رہا ہے لیکن جوٹ اور کپڑے کے کارخانے قائم ہو جانے سے مصنوعات کی برآمد کی نوبت بھی آگئی ہے جوٹ کی پاکستانی مصنوعات تو بیرونی منڈیوں میں پہنچ چکی ہیں۔ اب کپڑے کی برآمد کا مرحلہ آرہا ہے۔ ۳ مارچ کو تاجروں سے خطاب کرتے ہوئے وزیر تجارت مسٹر ابراہیم رحمت اللہ نے ان کو مشورہ دیا کہ اب وہ درآمد کی بجائے برآمد کی سوچیں اور دیکھیں کہ برآمد کے لئے کیا آسانیاں مہیا کی جائیں۔ یہ صورت حال واقعی خوش کن ہے لیکن دوسرے ملک جانے سے پہلے پاکستان کو یہ سوچنا ہو گا کہ کیا وہ پرانے اور منجھے ہوئے درآمدی ملکوں کا مقابلہ کر سکے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پاکستان نے بڑی صنعتی ترقی کی ہے لیکن اس کی مصنوعات بالعموم معیاری نہیں اور ان کی قیمتیں گراں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود اندرون ملک ان کا چلن نہیں ہو سکا۔ بیرون ملک یہ دشواریاں اور زیادہ شدت سے سامنے آئیں گی۔ لہٰذا پاکستانی صناعوں کو کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ مال کا معیار اونچا کریں۔ اور ان کی قیمتیں بھی مناسب رکھیں اس طرح وہ ملکی بازاروں میں بھی مقبول ہوں گے۔ اور غیر ملکی بازاروں میں بھی مقابلہ کر سکیں گے۔ لیکن اس کے

تاریخی شواہد

(۶)

لیکن کیا ان دھمکیوں سے خائف ہو کر حضرت نوحؑ نے اپنی دعوت چھوڑ دی؟ ایسا کس طرح ہو سکتا تھا! خدا کے بندوں کو کسی طرح کی تخویف و ترہیب ان کے مقصد سے باز نہیں رکھ سکتی۔ ان دھمکیوں کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُم مَّقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنظِرُونِ ۝ (۱۰/۷۱)

(اور اے پیغمبر) انہیں نوحؑ کا حال سناؤ، جب (ایسا ہوا تھا کہ) اس نے اپنی قوم سے کہا تھا اے میری قوم، اگر تم پر یہ بات شاق گزرتی ہے کہ میں تم میں (دعوت و ہدایت کے لئے) کھڑا ہوں اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ پند و نصیحت کرتا ہوں تو میرا بھروسہ صرف اللہ پر ہے۔ تم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو، اسے ٹھان لو۔ اور اپنے شریکوں کو بھی ساتھ لے لو۔ پھر جو کچھ تمہارا منصوبہ ہو اسے اچھی طرح سمجھ بوجھ لو کہ کوئی پہلو نظر سے نہ رہ جائے پھر جو کچھ میرے خلاف کرنا ہے کر گزرو اور مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو (اور دیکھو آخر کار کیا نتیجہ نکلتا ہے)!

چنانچہ ان کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی حتیٰ کہ حضرت نوحؑ ان کی طرف سے بالکل مایوس ہو گئے۔ اور اس ہجومِ مخالفت و تزاحم میں انہوں نے اپنے رب کو پکارا:

قَالَ رَبِّ انصُرْنِي بِمَا كَذَّبُونِ ۝ (۲۳/۲۶)

(اور) کہا۔ خدایا! انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے پس تو میری مدد کر!

سورۂ قمر میں ہے۔

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ ۝ (۵۴/۱۰)

پس اس نے اپنے رب کو پکارا کہ (اے اللہ العالمین) میں مغلوب ہوں سو تو میری مدد فرما۔

وہ اس سرکش قوم کی متمردانہ روش سے اس قدر تنگ آ چکے اور ان کے انکار و مخالفت سے اس قدر مایوس ہو چکے تھے کہ انہوں نے اپنے اللہ سے یہی التجا کی کہ

قَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا ۝ (۷۱/۲۶)

اے پروردگار! تو نافرمان لوگوں (کا نام و نشان) صفحۂ زمین پر باقی نہ چھوڑیو!

اس لئے کہ

إِنَّكَ إِن تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ (۷۱/۲۷)

اگر تو نے ان (نافرمان، سرکش لوگوں) کو (سلامت) چھوڑ دیا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے۔ اور ان کی نسل سے پیدا ہونے والی اولاد بھی (موروثی اور تربیتی اثرات کی وجہ سے) بدکردار و سرکش ہوگی۔

دعوت کی ابتدا میں اس دعوت کا جمالی پہلو نمایاں تھا۔ اخیر میں اللہ کے قانونِ مجازات کے ماتحت اس کا جلالی پہلو سامنے آ گیا۔ ادھر سرکشی و تمرد انتہا کو پہنچ گئی۔ ادھر قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق مہلت کا زمانہ گزر کر نتیجہ مرتب ہونے کا وقت آ گیا۔ حضرت نوحؑ سے ارشاد ہوا کہ ایک کشتی تیار کر لو۔

وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ۝ (۱۱/۳۶-۳۷)

اور نوحؑ پر وحی کی گئی کہ تیری قوم میں سے جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان کے سوا اب کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ پس جو کچھ یہ کر رہے ہیں، اس پر (بیکار کو) غم نہ کھا۔

اور (کہا گیا کہ) ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم کے مطابق ایک کشتی بنانا شروع کر دے اور ان ظالموں کے بارے میں اب ہم سے کچھ عرض معروض نہ کر۔ یقیناً یہ لوگ غرق ہو جانے والے ہیں!

دوسرے مقام پر ہے،

فَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ أَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا .... إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ وَإِن كُنَّا لَمُبْتَلِينَ ۝ (۲۳/۲۷-۳۰)

پس ہم نے نوحؑ کی طرف وحی بھیجی کہ ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق ایک کشتی بنا۔ پھر جب ایسا ہو کہ ہمارے حکم کا وقت آ جائے اور زمین کے چشمے پھوٹ نکلیں تو کشتی میں ہر جانور کے دو دو جوڑے ساتھ لے لے اور اپنے اہل کو بھی۔ مگر ایسے آدمی کو نہیں جس کے لئے اُس کے اعمال کی رُو سے تباہی کا پہلے فیصلہ ہو چکا ہے۔ اور دیکھ جن لوگوں نے ظلم کیا ہے ان کے بارے میں ہم سے کچھ عرض معروض نہ کیجیو، وہ ڈوب کر رہیں گے! اور جب تو اپنے رفقاء کے ساتھ کشتی میں سوار ہو جائے تو (اس وقت تیری زبان سے یہ صدا اٹھے) ساری ستائش اللہ کے قانونِ مکافات کے لئے ہے جس نے ہمیں ظالم قوم سے نجات دی۔ نیز یہ دعا بھی مانگیو کہ، خدایا! مجھے اب زمین پر اس طرح اتار کہ برکت کا اُترنا ہو اور تو سب سے بہتر جگہ دینے والا ہے!

بلاشبہ اس واقعہ میں (سمجھنے والوں کے لئے) بڑی ہی نشانیاں ہیں اور ہمارا قانونِ مکافات لیے مواقع بہم پہنچاتا رہتا ہے جس سے نتائج ابھر کر سامنے آ جائیں۔

کشتی بنا رہے تھے اور قوم کے سرکش سردار ان کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ حالانکہ ان کا یہ مضحکہ خود ان کی اپنی حالت پر تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اللہ کی گرفت انہیں کس سختی سے پکڑنے والی ہے۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ .... وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ۝ (۱۱/۳۸-۳۹)

چنانچہ نوحؑ کشتی بنانے لگا۔

اور جب کبھی ایسا ہوتا کہ ان کی قوم کا کوئی گروہ ان پر سے گزرتا، تو ان کو کشتی بنانے میں مشغول دیکھ کر تمسخر کرنے لگتا۔ نوحؑ کی طرف سے انہیں جواب ملتا کہ اگر تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو تو (اڑا لو) اسی طرح ہم بھی (تمہاری بے وقوفیوں پر) ایک دن ہنسیں گے۔ وہ وقت دور نہیں جب تمہیں معلوم ہو جائے گا کون ہے جس پر ایسا عذاب آتا ہے کہ اسے رسوا کرے، پھر دائمی عذاب بھی اس پر نازل ہو۔

کشتی تیار ہو گئی اور عذاب کا وقتِ معین آ پہنچا۔ حکم ہوا۔

حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّورُ ..... وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ ۝ (۱۱/۴۰)

(یہ سب کچھ ہوتا رہا) یہاں تک کہ جب وہ وقت آ گیا کہ ہماری ٹھہرائی ہوئی بات ظہور میں آئے اور زمین کے چشموں نے جوش مارا تو ہم نے (نوحؑ کو) حکم دیا کہ ہر قسم (کے جانوروں) کے دو دو جوڑے کشتی میں لے لو۔ اور اپنے اہل کو بھی ساتھ لو، مگر اہل میں وہ لوگ داخل نہیں جن کے لئے پہلے بات کہی جا چکی ہے (یعنی کہا جا چکا ہے کہ انہیں غرق ہونا ہے) نیز ان لوگوں کو بھی لے لو جو ایمان لا چکے ہیں اور نوحؑ کے ساتھ ایمان نہیں لائے تھے۔ مگر بہت تھوڑے سے آدمی۔

اور اس کے بعد۔

فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ السَّمَاءِ بِمَاءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ ..... جَزَاءً لِّمَن كَانَ كُفِرَ ۝ (۵۴/۱۱-۱۳)

پس ہم نے آسمان (بادلوں) کے دروازے برسنے والے پانی سے کھول دیئے اور زمین سے چشمے کھول دیئے تو اس طرح زمین و آسمان کا پانی اس معاملہ کے لئے جس کا (قانونِ مکافات کی رُو سے) اندازہ معین ہو چکا تھا ایک جگہ جمع ہو گیا۔ اور ہم نے اسے (نوحؑ کو) میخوں سے بنی ہوئی کشتی پر سوار کرا دیا۔ وہ ہماری نگرانی میں چل رہی تھی اور غرق ہونے کی سزا ان کے لئے تھی جنہوں نے اس سے انکار کیا تھا۔

اسلام کی سرگذشت

گذشتہ اشاعتوں میں عرب کی جغرافیائی پوزیشن ان کی نسبی معلومات اور اہم ترین قبائل اور ہمسایہ اقوام سے ان کے تجارتی اور ثقافتی روابط سے بحث کی گئی تھی۔ آیندہ سطور میں جزیرۂ عرب کی سرحدوں پر اسلام سے پہلے مختلف حکومتوں اور مدنیتوں کے قیام کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے باشندے اسلام سے پہلے تہذیب و تمدن سے قطعاً ناآشنا نہ تھے۔

کیا ہم یہ خیال بھی کر سکتے ہیں کہ یہ تجارت محض سامانِ تجارت اور سکوں کے تبادلہ تک محدود رہتی تھی۔ اس کا اثر معنوی اور ادبی شعبوں تک رسا نہیں ہوتا تھا؟ کم از کم ہم ایسا خیال نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ عربوں نے مادی تجارت پر مزید روم و ایران کی مدنیت اور ادب سے بہت کچھ حاصل کیا ہوگا۔ یہ بالکل طبعی چیز ہے۔ مہذب قوموں کی طرف سفر، ان سفر کرنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ایک نئی مدنیت لاتے تھے، اور یہ لوگ اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سے اکتساب کرتے تھے۔ خود یمن اور حجاز کے عرب آج بھی مصر اور شام کی طرف آتے ہیں تو یہ چیزیں حاصل کرتے بلکہ وہ ان دونوں ممالک کی مدنیت اور علوم کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ہم اس کو صحیح نہیں مان سکتے کہ اتنے بڑے بڑے قافلے اتنی بڑی تجارتوں کے ساتھ آتے جاتے ہوں تاکہ اجنبی قوموں کے ساتھ معاملات کر سکیں۔ اور ان میں ایسے آدمی موجود نہ ہوں جو اس اجنبی زبان کو جانتے ہوں، جیسے آج کل ترجمان ہوا کرتے ہیں۔ اور یہ لوگ ان کی مدنیت اور ادب کو اپنے ہاں منتقل کرنے کے اہل نہ ہوں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسا ہونا کسی حد تک صحیح ہو سکتا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھول جانا چاہیئے کہ جو لوگ اس قسم کی عظیم تجارتی مہموں میں حصہ لیتے تھے وہ ثروت اور عقل کے لحاظ سے قریش کے بڑے بڑے لوگ ہوتے تھے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ ان قافلوں میں جانے والے ابوسفیان، مخرمہ ابن نوفل اور عمرو بن العاص جیسے لوگ ہوتے تھے جو بلاشبہ اپنی قوم کے سردار تھے۔ ان میں سے بعض تو لوگ بھی ہیں جن کا ہاتھ اسلام کے بعد بھی امت کے انتظامی حالات میں رہا ہے۔ یہ لوگ کسی طرح بھی آج کل کے ترجمانوں ہی کی طرح نہیں تھے۔ بلکہ ان سے بہت اونچے تھے۔ ان میں اس معاشی نظام، بلند عمارات، اور معبدوں کو جو وہ وہاں دیکھتے تھے اپنے ہاں منتقل کرنے کی بڑی استعداد موجود تھی۔ بازاروں میں حکومت کا کنٹرول اور ٹیکس کی وصولیابی جو یہ لوگ وہاں دیکھتے تھے، جو قصص و آداب وہ وہاں سنتے تھے ضرور اپنے ہاں لاتے ہوں گے۔ تجارت سے فارغ ہو کر جب وہ واپس لوٹتے ہوں گے تو اجنبی زبان جاننے والے ان کی باتیں دوسرے لوگوں کو جو ان کی زبان نہیں جانتے تھے، ضرور سناتے ہوں گے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ صحیح نقل اور دقیق ترجمہ نہیں ہوتا ہوگا اور نہ ہی اس میں تاریخی یا ادبی دقیق مشابہت ہوتی ہوگی۔ اس چیز کا تو کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا یہ کچھ تاریخی اور ادبی چیزیں ہوتی ہوں گی ——— جو اگرچہ زبانی ہی منتقل ہوتی ہوں گی ——— لیکن عربوں کی عقلیت پر ضرور اثر ڈالتی ہوں گی۔ آج ہم اس استفادہ کی یہ دلیل پیش کر سکتے ہیں کہ عربوں نے زمانۂ جاہلیت میں بہت سے فارسی، رومی، مصری اور حبشی کلمات اپنی زبان میں داخل کر لئے تھے جنہیں ان جیسے تاجر ہی ساتھ لائے تھے۔ اور انہوں نے ہی ان کلمات کو عربیت کا جزو بنا دیا تھا۔ ان الفاظ پر انہوں نے اپنے لسانی قوانین جاری کئے جن میں سے بہت سے الفاظ قرآن کریم تک میں موجود ہیں اس امر کے دیگر دلائل بھی موجود ہیں جو ہم بعد میں بیان کریں گے۔

سرحدات پر عربی مدنیتوں کا قیام

جب ہم ایشیا کے نقشہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جزیرۂ عرب اس زمانہ کی دنیا کی دو عظیم ترین تہذیبوں کے درمیان واقع تھا۔ مشرق میں ایران اور مغرب میں روم۔ ایران اور روم نے بارہا ارادہ کیا کہ وہ عربوں کو اپنی حکومت کے ماتحت لے آئیں۔ کیونکہ ان کی آئے دن کی لوٹ مار سے انہیں ہمیشہ اندیشہ رہتا تھا۔ لیکن جب وہ دیکھتے تھے کہ اس صحرائی جزیرہ کو فتح کرنے میں مالی اور جانی بہت سی قربانیاں دینی پڑیں گی تو وہ اس سے پہلوتہی کرنے ہی کو بہتر سمجھتے تھے۔ پھر عرب معیشت نے طبعاً انہیں ایسا بنا دیا تھا کہ وہ کسی ایک قوت کے مطیع نہیں تھے جس پر کوئی جنگجو قوم غالب آجائے تو پوری قوم اس کی مطیع ہو جائے۔ یہاں تو بہت سی قوتیں اور عصبیتیں کارفرما تھیں۔ لہٰذا اس ملک پر قبضہ کرنے کے لئے ان تمام قوتوں اور عصبیتوں پر استیلا ضروری تھا۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس وجہ سے ایران اور روم نے دیکھا کہ عربوں کے شر کو رفع کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ ان قبائل کو مدد دیں جو سرحدات پر واقع ہیں کہ وہ کھیتی باڑی کر کے متمدن زندگی بسر کریں اور پھر یہ قبائل ان کے لئے آڑ بن جائیں جو بدوؤں کی لوٹ مار کو روک سکیں۔ چنانچہ ایران کی سرحد پر حیرہ کی حکومت اور روم کی سرحد پر غسانیوں کی حکومت قائم ہو گئی۔

حیرہ کی حکومت

تاریخ میں حیرہ کی مملکت قائم ہونے سے پہلے قدیم زمانہ سے ایران کی سرحد پر عربوں کا وجود ملتا ہے۔ جس کے بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ شاپور اول شہنشاہ ایران کے عہد (تقریباً ۲۴۰ء) میں ایران نے نہر فرات کے کنارے پر حیرہ کی مملکت کی بنیاد رکھ کر عمرو بن عدی کو اس کا امیر مقرر کیا تھا۔

یہ نظام چلا آرہا تھا کہ حیرہ کے عرب شہنشاہ ایران کی اطاعت کا دم بھرتے تھے اور وہ ان پر اپنی طرف سے ایک امیر مقرر کر دیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان کی طرف سے ایران پر ہر حملہ آور کی مدافعت کریں اور اس کے بالمقابل ایران نے ان لوگوں کو ٹیکس کی ادائیگی سے معافی دے رکھی تھی۔

اس زمانہ میں ایران میں جاگیرداری نظام رائج تھا۔ ہر والی اپنی جاگیر کے اندرونی معاملات میں آزاد اور مستقل ہوتا تھا اور اکثر اوقات جب تک وہ زندہ رہتا تھا برابر والی رہتا تھا۔ بادشاہ جن لوگوں کو والی بناتے تھے ان میں اس جاگیرداری کی رغبت اور شوق کی رعایت رکھتے تھے۔ یہ طریقہ رومی نظام کے برعکس تھا جو ایک مرکزی نظام تھا۔

مزید برآں حیرہ کے عربوں کو زیادہ استقلال اور آزادی حاصل تھی۔ ایران کے ساتھ ان کا ارتباط اتنا ہی تھا جتنا کہ باہمی معاہدات ضروری قرار دیتے تھے شہنشاہ ایران عادتاً ان لوگوں پر قبیلۂ لخم کا کسی آدمی کو مقرر کرتا تھا۔ (یہ در اصل یمنی قبیلہ ہے جیسا کہ نسب نگاروں نے بیان کیا ہے) اور جب کوئی امیر مر جاتا تھا تو اسی گھرانے میں سے جس شخص کو شہنشاہ پسند کرتا تھا ان پر امیر مقرر کر دیا کرتا تھا۔

حیرہ کے عرب ان دنوں بڑی فارغ البال تھے۔ دوسرے عرب لوگ ان پر حسد کرتے تھے۔ کیونکہ ان کی زمینیں سرسبز اور ان کا ملک بڑا مالدار تھا۔ وہ ایران اور جزیرہ کے عربوں کے درمیان کی کڑی تھے۔ ایران کا تجارتی مال یہی لوگ عربستان میں لاتے اور ان کے بازاروں میں فروخت کرتے تھے۔ یہ لوگ ایران اور ایرانی مدنیت سے بڑے خوش تھے۔ یزدگرد اول (۳۹۹ — ۴۲۰ء) کے عہد میں شہنشاہ نے اپنے بڑے بیٹے بہرام کو حیرہ کے عربوں میں بھیج دیا تھا۔ تاکہ وہ ان کے درمیان پرورش پائے اور شکار کرنا سیکھے۔ نیز یہاں کی عمدہ آب و ہوا سے توانائی حاصل کرے۔ یہ نعمان اول کے زمانہ کی بات ہے۔ یہ بہرام گور عربی زبان بھی اسی طرح جانتا تھا جیسا کہ یونانی زبان جانتا تھا۔ یزدگرد کی موت کے بعد اس کے بھائی نے حکومت کے بارے میں اس سے مقابلہ کیا تو عربوں نے بہرام گور کی مدد کی۔ جب وہ تخت نشین ہو گیا تو حیرہ کے عربوں نے اس پر جو احسان کیا تھا وہ اسے کبھی نہیں بھول سکا۔ اس نے عربوں کو اپنا مقرب بنایا اور ان کی شان کو اور بھی بلند کر دیا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیرہ کی شان و شوکت منذر سوم کے عہد میں اپنے عروج کو پہنچی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ بعض مورخین نے بیان کیا ہے کہ جب ایران اور روم کے درمیان ۵۳۲ء میں صلح ہوئی تو ایک شرط یہ بھی تھی کہ رومی سلطنت مال کی ایک خاص مقدار شہنشاہ ایران اور منذر کو ادا کرے۔ اس کے چند سال بعد منذر نے محسوس کر لیا کہ ایران کمزور ہوتا جا رہا ہے چنانچہ وہ رومیوں کا حلیف ہو گیا۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد پھر اس کا میلان ایران کی طرف ہو گیا۔

فردوس گم گشتہ

محترم پرویز صاحب کے
مضامین کا مجموعہ!

فکر و نظر کی نئی راہیں!!

قیمت ۶ روپے

مجلسِ اقبال

(۲)

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے "فلسفۂ سخت کوشی" کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے اس باب میں جو کچھ فرمایا ہے اس کا مدار علیہ وہ خیالات ہیں جو میں نے حقیقت کے متعلق اپنی نظموں میں ظاہر کئے ہیں۔ میرے عقیدے میں حقیقت ایسے اجزا کا مجموعہ ہے جو تصادم کے واسطے سے ربط و امتزاج پیدا کر کے "کل" کی صورت میں تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں۔ اور یہ تصادم لا محالہ اُن کی شیرازہ بندی اور ارتباط پر منتج ہوگا۔ دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے علو و ارتقا کے لئے تصادم نہایت ضروری ہے۔ نیٹشے بقائے شخصی کا منکر ہے۔ جو شخص حصولِ بقا کے آرزومند ہیں وہ اُن سے کہتا ہے "کیا تم ہمیشہ کے لئے زمانہ کی پشت کا بوجھ بنے رہنا چاہتے ہو" اس کے قلم سے یہ الفاظ اس لئے نکلے ہیں کہ زمانے کے متعلق اس کا تصور غلط تھا۔ اُس نے کبھی مسئلہ زمان کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ بخلاف اس کے میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاعِ گرانمایہ ہے جس کے حصول پر وہ اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام صور و اشکالِ مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو، مردود قرار دیا ہے۔

میں تصادم کو سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں۔ حالانکہ اس باب میں نیٹشے کے خیالات کا مدار غالباً سیاست ہے۔ جدید طبیعیات سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مادی قوت کے جزو لایتجزیٰ نے ہزارہا سال تک ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد موجودہ صورت اختیار کی ہے۔ پھر بھی وہ فانی ہے اور اسے مٹا دیا جا سکتا ہے۔ قوتِ ذہنی یا یوں کہیئے کہ جسمِ انسانی کے ذرہ یا پانو کی بھی یہی کیفیت ہے۔ صدہا برس کی مسلسل جدوجہد اور تصادم و پیکار کے بعد وہ موجودہ صورت تک پہنچا ہے۔ پھر بھی عوارضِ ذہنی کے مظاہرِ مختلفہ سے اس کی بے ثباتی اور عدم استحکام ظاہر ہے۔ اگر وہ بدستور قائم و باقی رہنا چاہتا ہے تو یقیناً ماضی کے درسِ عبرت کو فراموش نہیں کر سکتا۔ اسے لا محالہ ان قوتوں سے قیام کی خاطر استمداد کرنی پڑے گی جو آج تک اس کے استحکام کی ضامن رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ فطرت کا ارتقا ان قوتوں میں اصلاح کرتے یا ان میں سے بعض کو (مثلاً تصادم اور جنگ و پیکار کو جو استحکام کے قوی عوامل میں سے ہیں) جو اس کے ارتقا کی کڑیاں بنی رہی ہیں بالکل مٹا دے۔ اور اس کے استحکام و بقا کی خاطر بعض ایسی قوتیں عرصۂ شہود میں لے آئے جن سے انسان آج تک نا آشنا رہا ہے لیکن میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اس باب میں کسی نصب العین کا پرستار نہیں ہوں۔ اس لئے میرے نزدیک اس نوع کے انقلاب کا زمانہ ابھی بہت دور ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ یورپ کی جنگِ عظیم میں انسان کی بصیرت و موعظت کا جو سرمایہ پنہاں ہے وہ اس سے عرصۂ دراز تک متمتع نہ ہو سکے گا۔

ان سطور سے واضح ہو گیا ہے کہ میں نے محض اخلاقی زاویۂ نگاہ سے تصادم و پیکار کو ضروری قرار دیا ہے۔ افسوس ہے کہ مسٹر ڈکنسن نے "فلسفۂ سخت کوشی" کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔

مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے لیکن باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود۔ ایک حیثیت سے ان کا ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعرا اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اُسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اولین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرہ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معین راہِ عمل رکھتی ہو لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔

اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط ہے کہ سائنس اسلام کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسان سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کر دیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافی حدود و ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں استیلا حاصل کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوع کی حیثیت سے یہ یاد دلانا مستحب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کا نشو و ارتقا ہے نسل اور حدود و ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیاتِ اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن میں اس چیز کا مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوتِ عمل کا مظہرِ اتم سمجھ لیا جائے۔

یہ درست ہے کہ مجھے اسلام سے بے حد محبت ہے لیکن مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال صحیح نہیں کہ میں نے محض اس محبت کے پیش نظر مسلمانوں کو اپنا مخاطب ٹھہرایا ہے۔ بلکہ دراصل عملی حیثیت سے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ایک خاص جماعت یعنی مسلمانوں کو اپنا مخاطب قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا یہی جماعت میرے مقاصد کے لئے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی تسامح سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کائنات انسانیت کے اتحادِ عمومی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے، اور کہتا ہے،

تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَآءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ

میرے خیال میں ڈکنسن کا ذہن ابھی تک یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا کہ اسلام سفاکی اور خونریزی کا درس دیتا ہے۔ دراصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں اور ایک دوسرے کی شخصیت تسلیم کر لیں۔ انجمنیں حکومتیں یا اس قسم کے عہد نامے جن کا ذکر مسٹر کینیڈی نے کیا ہے ملوکیت خواہ وہ جمہوریت کی ہی قبا میں پوشیدہ کیوں نہ ہو، انسان کو فوز و فلاح سے آشنا نہیں کر سکتی۔ بلکہ انسانی فلاح تمام انسانوں کی مساوات اور حریت میں پنہاں ہے۔ آج ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ سائنس کا محل استعمال قطعی طور پر بدل دیا جائے۔ اُن خفیہ سیاسی منصوبوں سے احتراز کیا جائے جن کا مقصد بھی یہ ہے کہ کمزور و زبوں حال یا ایسی اقوام جو عیاری اور حیلہ گری کے فن میں چنداں مہارت نہیں رکھتیں، صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح جنگ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بھی فتوحات کی ہیں مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ اُن کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے ہیں۔ لیکن مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کشور کشائی اور ملک گیری ابتداءً اسلام کے مقاصد میں داخل نہیں تھی۔

اسلام کو جہاں ستانی اور کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی ہے، میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد کے حق میں بے حد مضر تھی۔ اس طرح وہ اقتصادی اور جمہوری اصول نشو و نما نہ پا سکے جن کا ذکر قرآن کریم اور احادیث نبوی میں جا بجا آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر لی۔ لیکن ساتھ ہی ان کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا۔ اور انہوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں کہ اسلامی اصولوں کی گیرائی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔

اسلام کا مقصد یقیناً یہ ہے کہ دوسری قوموں کی جداگانہ حیثیت مٹا ڈالے اور انہیں اپنے اندر جذب کر لے۔ بلکہ صرف اسلام کی سیدھی سادی تعلیم جو الٰہیات کی دقیق اور پیچیدہ مسائل سے پاک اور عقلِ انسانی کے عین مطابق واقع ہوئی ہے، اس عقدہ کی گرہ کشائی کر سکتی ہے۔ اسلام کی فطرت میں ایسے اوصاف پنہاں ہیں جن کی بدولت وہ کامیابی کے بامِ بلند پر پہنچ سکتا ہے۔ ذرا چین کے حالات پر نظر ڈالئے جہاں کسی سیاسی قوت کی پشت پناہی کے بغیر اسلام کے تبلیغی مشن نے غیر معمولی کامیابی حاصل کر لی۔ اور لاکھوں انسان خیل در خیل اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے ہیں۔ میں بیس سال سے دنیا کے افکار کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ اس طویل عرصے نے مجھ میں اس قدر صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ حالات و واقعات پر غیر جانبدارانہ

(بقایا صفحہ ۱۴ پر)

عورت کا قرآن

(۵)

مطلب یہ تھا کہ جو باتیں حق تعالیٰ نے بیان نہیں فرمائی ہیں یا جن جزئیات کو قرآن کریم نے متعین نہیں کیا ہے وہ اس لئے نہیں رہ گئیں کہ خدا کو معاذ اللہ بھول لاحق ہو گئی تھی بلکہ حکمت الٰہیہ کا تقاضا ہی یہ تھا کہ ان کو متعین نہ کیا جائے کیونکہ وہ اس قسم کی جزئیات و مسائل ہیں جو زمانہ کے مختلف ادوار میں ان کے نئے نئے تقاضوں کے ماتحت بدلتے سدلتے رہنے والے ہیں۔ اگر ان کو کرید کر پوچھا جائیگا اور وہ متعین کر دی جائیں گی تو وہ موجودہ دور نزولِ قرآن میں تو معاشرہ کا ساتھ دے سکیں گی لیکن بعد میں بدل جانے والے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکیں گی اور چونکہ کتاب الٰہی ان کو متعین کر چکی ہو گی اس لئے ان کو چھوڑا بھی نہیں جا سکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ جزئیات جو اس طرح متعین کر دی جائیں گی آگے چل کر تمہارے لئے تکلیف اور اذیت کا باعث بن جائیں گی۔ البتہ ایسی جزئیات جو تغیر احوال سے اثر پذیر ہونے والی نہیں ہیں انہیں خود ہی قرآن نے متعین کر دیا ہے۔

تغیر پذیر جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دینے کا منشاء یہ ہے کہ تغیر پذیر حالات کے ماتحت ان اصول کی روشنی میں جو قرآن نے ان کو عطا کر دیئے ہیں اسلامی معاشرہ ہر زمانہ میں اپنے تقاضوں کے مطابق ان کو متعین کرتا چلا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس میں جس طرح "مرد" کو استنباط، یا عقل سے فیصلہ کرنے کا حق ہے اسی طرح "عورت" کو بھی۔

زیر نظر کتاب میں، قرآن مجید کی ایک سو چودہ صورتوں میں سے منتخب کر کے، صرف وہ آیتیں مع ترجمہ پیش کی گئی ہیں جو کسی نہ کسی طرح "عورت" سے متعلق ہیں یا جن میں "عورت" کا ذکر ہے۔ اسی لئے اس کتاب کا نام "عورت کا قرآن" رکھا گیا ہے۔ ترجمے میں زیادہ تر مولانا ابوالکلام آزاد اور کہیں کہیں مولانا غلام احمد پرویز اور مولانا اشرف علی تھانوی کے ترجموں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اور آیتوں کے حوالے میں رکوع کا نمبر دیا گیا ہے اس لئے کہ آیت کا نمبر قرآن میں نہیں ہوا کرتا۔ یا مسئلوں اور نکتوں کو سمجھنے کے لئے جو کچھ لکھا گیا ہے وہ "قرآن مجید" کی روشنی میں لکھا گیا ہے اس لئے کہ اس وقت مسلمانوں میں تنہا یہی ایک کتاب ہے جو انسانی تصنیف نہ ہونے کے سبب بحیثیت "دستور العمل" مسلم ہے اور جس پر سارے مسلمان متفق ہیں اور جس میں کسی ملک کسی طبقے اور کسی فرقے کے مسلمان کو کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ اور اس بارے میں بسلسلۂ بحث و تذکرہ جس قدر بھی رائیں پیش کی گئی ہیں وہ قرآن میں بصیرت تامہ رکھنے والے مستند علمائے قرآن کی ہیں۔ اور خود میں نے بھی کسی رد و رعایت کے بغیر قرآن پاک سے جو کچھ سمجھا یا اکابر کی تحریروں سے جو کچھ صحیح سمجھ کر تسلیم کیا ہے، وہی پیش کیا ہے "تاکہ بلا تفریق طبقہ و فرقہ ہر مسلمان کے لئے یہ کتاب آخری سند اور یکساں طور سے بکار آمد ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

نوٹ، تشریح: وضاحت کا ایک مزید درجہ ہیں ورنہ قرآن کا صاف صاف مطلب سمجھ لینے کے لئے متن کا درجہ پوری طرح کفایت کرتا ہے۔

(مقدمہ ترجمان القرآن)

اُن تمام آیتوں کو جو "عورت" سے متعلق ہیں، پانچ ابواب میں یوں تقسیم کیا گیا ہے:

(۱) پہلے باب میں "مسائلِ نسواں" کے عنوان سے وہ آیتیں پیش کی گئی ہیں جو "عورت" کے سلسلے میں، مسائل و احکام سے براہ راست متعلق ہیں۔ اس باب میں کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان، عنوان متعین کر کے، اس سلسلے کی جتنی بھی آیتیں "قرآن مجید" میں جہاں جہاں پر بھی ہیں، یکجا کر دی جائیں۔ بعض عنوان مفرد ملیں گے اور بعض مرکب۔ اس لئے کہ وہ مسئلے آیتوں میں کچھ اس طرح باہم ملے ہوئے ہیں کہ اُن کی تفریق سے قرآن مجید کا آہنگ بگڑ جانے کا احتمال تھا، سیاق و سباق میں فرق آ جانے کا اندیشہ تھا بلکہ یوں کہیئے کہ قرآن مجید کی آیتوں کو صحیح طور پر سمجھنے ہی میں دقت پڑ جانے کا خدشہ تھا۔

(۲) دوسرے باب میں "تذکرات" کے عنوان سے صرف وہ آیتیں یکجا کی گئی ہیں جن میں "عورت" کے قصے مذکور ہوئے ہیں چاہے وہ مومنہ ہو یا مشرکہ۔

(۳) تیسرے باب میں "اُمہات المومنین" کے عنوان سے صرف وہ آیتیں نقل کی گئی ہیں جن کا تعلق بطور خاص "ازواج مطہرات" سے ہے۔ البتہ اس سلسلے کی بعض آیتیں، جن کا تعلق صرف حرمِ رسالت ہی سے نہیں بلکہ اُمت سے بھی ہے یا تھا، وہ دوسری جگہ بھی ملیں گی۔

(۴) چوتھے باب میں "ذکرِ مشترک" کے عنوان سے صرف وہ آیتیں اکٹھا کر کے پیش کی گئی ہیں جن میں "عورت" اور "مرد" دونوں کا ذکر دوش بدوش، ساتھ ساتھ اور مشترک طور پر کیا گیا ہے۔ ایک ہی پیمانے سے دونوں کی نیکیاں اور بدیاں ماپنے کا ذکر کیا گیا ہے ایک ہی میزان سے دونوں کے اعمال وزن کرنے کا اظہار کیا گیا ہے اور ایک ہی قلم سے دونوں کی تقدیروں کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ دونوں میں کوئی بھی تفریق نہیں، کوئی بھی امتیاز نہیں اور کوئی بھی تقسیم نہیں۔

(۵) پانچویں اور آخری باب میں بطور تبرک یا خاتمۂ کتاب بغرض تعلیم و دانست "دعائیں" کے عنوان سے وہ آیتیں درج کی گئی ہیں جن میں والدین یا اولاد کے لئے دعائیں ہیں اور ظاہر ہے کہ والدین ہوں یا اولاد، دونوں میں "عورت" کی شرکت برابر ہے۔

جہاں تک کہ "عورت" کا بطور خاص انفرادی تعلق ہے بس اسی قدر آیتیں قرآن مجید میں ہیں۔ حتی الامکان کوشش تو کی گئی ہے کہ کوئی بھی ایسی آیت چھوٹنے نہ پائے، اور کسی نہ کسی طرح متن یا حاشیہ میں ضرور آ جائے جس میں عورت یا اس کا کچھ بھی ذکر آ گیا ہے۔ مگر بھول چوک انسان کی فطرت میں داخل ہے اور غلطی، بالفعل مردوں کے، عورت کی سرشت میں داخل ہے۔ نیز یہ میری بالکل پہلی کوشش ہے جس پر کلی اعتماد کرنا صحیح نہیں، لہٰذا ممکن ہے کہ ایک یا متعدد آیتیں چھوٹ بھی گئی ہوں۔ اگر قارئین میں سے کوئی بھائی یا بہن ایسا پائیں تو مجھے ازراہ عنایت ضرور مطلع کر دیں تاکہ اگر حیات اور موقع اجازت دے تو اس کمی کو آئندہ پورا کر دیا جائے جعفر اقبال مرحوم نے تو فرمایا تھا کہ

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

لہٰذا میرا ہمت کرنا ممکن نہ تھا۔ مگر چونکہ انہوں نے یہ بھی اشارہ کر دیا تھا کہ ؎

اس راز کو "عورت" کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں، معذور ہیں، مردانِ خرد مند!

اس لئے میں نے اللہ کا نام لے کر سب سے پہلے مناسب سمجھا کہ "عورت" کو قرآن مجید سے متعارف کرایا جائے اور اس طور پر اُن میں خدا اور اس کے بندے دونوں کو سمجھنے کے بعد کچھ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو گا۔

قرآن مجید ایک مرتبہ پورے کا پورا نازل نہیں ہوا بلکہ آنحضرت صلعم کی تئیس سالہ پیمبرانہ زندگی میں ضرورت اور موقع کے مطابق تھوڑا تھوڑا کر کے وقتاً فوقتاً نازل ہوا۔ چنانچہ اس کی ۱۱۴ سورتوں میں سے ۸۶ رسول کریم کی مکی زندگی میں، مکے میں نازل ہوئیں اور ۲۸ مدنی زندگی میں، مدینہ میں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں عورتوں کے متعلق احکام کا ایک موقع پر ایک جگہ مرتب شکل میں پایا جانا ناممکن ہے۔ چنانچہ باستثناء چند ایک عنوان کے احکام متعدد مقامات پر ادھر اُدھر منتشر ہیں اور ستاروں کی طرح بظاہر بے ترتیب۔ عنوانات کے تحت میں نے اُن تمام آیتوں کو ایک جگہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک حد تک معنوی ربط بھی پیدا ہو جائے تاکہ سمجھنے میں کچھ آسانی ہو۔

بعض جگہ میرے لئے بہت سخت منزل آ گئی مگر ایسی جگہوں کو نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا اور اُن سے عہدہ برا ہونا بھی مشکل۔ نتیجتاً میں نے کوشش کی ہے کہ جس حد تک ممکن ہو شائستگی نظر انداز نہ ہونے پائے۔ مگر "حیا" کا جو معیار فی الحال قائم کیا گیا ہے، ممکن ہے میری شائستگی، اس سلسلے میں پوری نہ اُترے۔ اگر ایسا ہو تو مجھے معذور و مجبور سمجھا جائے۔ احکام الٰہی کے ذکر میں عورت کے مسائل جب سامنے آئیں گے اور انہیں سمجھنا یا سمجھانا پڑے گا تو لا محالہ ایسی مشکلات پیش آئیں گی اور ان میں خجالت کا احساس، حیا داری نہیں ضرورت سے زیادہ بننا ہے جو بدتمیزی میں داخل ہے۔

طاہرہ کے نام

طاہرہ بیٹی! شاہدہ کی ازدواجی زندگی کے انجام سے جس قدر تم افسردہ ہو میں اس سے کم ملول خاطر نہیں ہوں۔ لیکن تمہاری افسردگی اور میرے ملول کی وجوہات مختلف ہیں۔ تم افسردہ ہو کہ شاہدہ تمہاری بچپن کی سہیلی ہے۔ تم اس کی خوشی اور غم میں برابر کی شریک ہو۔ تم اس کی آزردہ حالت کو دیکھ نہیں سکتیں لیکن مجھے صدمہ اس کا ہے کہ میں جس بات کو اتنے عرصے بار بار دہرا رہا تھا شاہدہ نے اس پر کان نہ دھرا اور بالآخر وہ کچھ ہو کر رہا جس کے ہونے کے تصور سے میری روح کانپتی تھی۔ مشکل یہ ہے کہ ایک تو ہمارے معاشرہ میں زیادتی بالعموم مردوں کی طرف سے ہوتی ہے اور عورتوں کی مظلومیت ایک مسلمہ کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ پھر اور یہ کہتے ہوئے میں جھجکتا ہوں کہ کہیں تم بھی برا نہ مناؤ لیکن حق بات کو بہرحال کہنا ہی پڑتا ہے کہ عورت اور مرد کے تنازع میں عورتیں عورت ہی کا ساتھ دیتیں اور مرد کو (حیثیتہً) مجرم گردانتی ہیں۔ اگر تم شاہدہ کی زندگی اور اس کے انجام پر جذبات سے خالی ہو کر غور کرو تو تم یقیناً مجھ سے متفق ہوگی کہ اس روش کا یہ نتیجہ لازمی تھا۔ اس میں سعید کا کوئی قصور نہیں۔ بلکہ اس نے تو اتنا عرصہ جس ہمت، تحمل، بردباری اور برداشت سے کام لیا ہے اس کی داد دینی پڑتی ہے۔

شاہدہ کی زندگی یہ تھی کہ وہ نو بجے سے پہلے کبھی سو کر نہ اٹھتی تھی۔ اس لئے کہ وہ آدھی رات سے پہلے کبھی سوتی نہیں تھی۔ آج کلب میں گئی ہے۔ کل کہیں جلسہ تھا اس میں تقریر تھی اگلے دن سینما کے آخری شو میں گئی ہوئی تھی۔ جب کہیں باہر کوئی تقریب نہیں گھر پر دوستوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ کھانے کے بعد آدھی رات تک گپ بازی رہی۔ سعید بچارے کو دن بھر دفتر میں کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ آدھی آدھی رات تک کس طرح جاگ سکتا تھا شروع شروع میں تو اس نے شاہدہ کے شبانہ پروگراموں میں اس کا ساتھ دیا۔ لیکن اس کے بعد وہ اس سلسلہ کو جاری نہ رکھ سکا۔ ہاں یہ اس کی سعادت یہ تھی کہ اس نے شاہدہ کو سختی یا ترشی سے کبھی کچھ نہیں کہا سمجھانے کی کوشش ضرور کی لیکن سختی پر کبھی نہیں اترا۔ وہ آدھی آدھی رات کو باہر سے آتی اور یہ خود اٹھ کر دروازہ کھولتا۔ صبح آٹھ بجے دونوں بچیوں نے اسکول جانا ہوتا تھا۔ ذرا سوچو کہ جن بچیوں کی ماں سو رہی ہو انہیں صبح اٹھا کر اسکول کے لئے تیار کرنے میں باپ کو کس قدر زحمت اٹھانی پڑتی ہے۔ لیکن سعید یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے کرتا۔ اس پر مشکل یہ کہ بڑی بچی نہ اتنی بڑی تھی کہ وہ اپنی دیکھ بھال آپ کر سکتی۔ اور نہ اتنی چھوٹی تھی کہ باپ اسے نہلا دھلا کپڑے بدلوا کر اسکول کے لئے تیار کر دیتا۔ نہ ہی یہ کام نوکروں کے سپرد کئے جانے کا تھا۔ اس مقصد کے لئے ایک آیا الگ رکھنی پڑی تھی۔ سعید یہ بھی جانتا تھا کہ اگر بچیوں کو آیا ہی پر چھوڑ دیا تو ان کی تربیت پر کیا اثر پڑے گا۔ اس لئے اسے خود بھی نگرانی کرنی پڑتی۔ اس کے ساتھ ہی اسے نو بجے دفتر پہنچنا ہوتا تھا۔ اس کے لئے بھی تیاری کرنی ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ گھر میں اس وقت میں ہوتا جب شاہدہ پڑی سو رہی ہوتی جب وہ سو کر اٹھتی تو بچیاں سکول اور خاوند دفتر جا چکے ہوتے۔ اٹھنے کے بعد قریب گھنٹہ بھر میں نیند کا خمار اترتا۔ (دیر سے اٹھنے کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے) اس کے بعد ناشتہ کیا جاتا۔ ناشتہ کے بعد اخبار یا ایک آدھ رسالہ پڑھا جاتا۔ وہ مسز ایسوسی ایشن کی سکریٹری شپ اس کے سپرد تھی۔ اس کی ڈاک اور کاغذات دیکھتی۔ ایسوسی ایشن کے رسالہ کے لئے کوئی مضمون لکھتی جس میں بتایا جاتا کہ گھری زندگی کو خوشگوار کیسے بنایا جا سکتا ہے اور بچوں کی صحیح تربیت کس طرح کی جاتی ہے۔ پھر دوپہر کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔ کھانے کے بعد کچھ وقت کے لئے ریڈیو یا گراموفون ریکارڈ سنے جاتے۔ اتنے میں نیند آ جاتی۔ اگر بچیاں سکول سے ایسے وقت آگئیں جب کہ ابھی سوئی نہیں تھیں تو "گڈ مارننگ" ہی ہو جاتا۔ ورنہ وہ اسکول سے آکر بچو نوکروں کے ہاتھوں کھانا کھا کر کھیلنے لگ جاتیں۔ اس کے بعد ان کا اتالیق (گھر پر پڑھانے والا ماسٹر) آ جاتا وہ اپنے کمرے میں لکھنے پڑھنے میں مصروف ہو جاتیں۔ امی اٹھتیں اور نہا دھو کر چائے پیتیں۔ اور پھر یا تو بیڈمنٹن (یا ٹیبل ٹینس) کے لئے کلب چلی جاتیں یا شاپنگ کے لئے بازار۔ سعید دفتر سے تھکا ماندہ آتا اور بچیوں کی دیکھ بھال، نوکروں سے حساب فہمی اور گھر کی چیزوں کی نگرانی اور محاسبہ میں مصروف ہو جاتا۔ رات کا کھانا (وہ بھی اگر باہر نہ ہوتی) تو اکٹھا کھایا جاتا۔ اور اس میں میاں، بیوی اور بچیاں ایک میز پر جمع ہو جاتیں لیکن یہاں کی گفتگو بھی بالعموم "تلخ انجام" ہی رہتی۔ شاہدہ ہمیشہ نوکروں کی بدتمیزی۔ گھر کی بدنظمی۔ بچیوں کی بےسلیقگی۔ میاں کی بےتوجہی کی شکایت کرتیں۔ اور جب سعید اتنا کہہ دیتا کہ ذرا سوچو کہ تم ان امور کی اصلاح میں کتنا حصہ لیتی ہو تو فوراً بات بگڑ جاتی۔

کیوں طاہرہ! جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ غلط تو نہیں اگر غلط ہے تو اس کی ذمہ دار خود تم ہو۔ اس لئے کہ یہ باتیں خود تم ہی مجھ سے آ آ کر کہا کرتی تھیں۔ اور یہ بھی بتایا کرتی تھیں کہ تم شاہدہ کو سمجھاتی ہو لیکن اس کی سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔ تم ہی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ گھر کی بدنظمی اور ویرانی کے علاوہ اس روش زندگی کا اثر خود شاہدہ کی صحت پر کس قدر پڑ رہا تھا۔ نہ وقت پر سونا نہ وقت پر کھانا۔ پھر جو کچھ کھانا وہ کلبوں اور ہوٹلوں کا کھانا۔ جس میں پلیٹ اور گلاس کی صفائی پر تو بہت زور دیا جاتا ہے (اگرچہ اس کا بھی کسی کو علم نہیں ہوتا کہ وہ صفائی ہوتی کس طرح سے ہے) لیکن کھانے کے اجزاء کی طرف کسی کا خیال نہیں جاتا۔ صحت خراب ہوئی تو اس کی طبیعت میں چڑچڑاپن بھی آگیا۔ اس کے ساتھ ہی اخراجات بھی بڑھ گئے۔ پہلے بھی نوکروں کی وجہ سے گھر کا خرچ بہت زیادہ اٹھ رہا تھا۔ (اور نوکر زیادہ اس لئے رکھنے پڑتے تھے کہ شاہدہ کو اپنی سوشل تقریبات اور ایسوسی ایشن کے دھندوں ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی جو گھر کی طرف دھیان دے سکے۔) اب ڈاکٹروں کی فیس اور ڈرائیوروں کے بل نے رہی سہی کسر نکال دی۔ آمدنی تو لے دے کے سعید کی تنخواہ ہی تھی۔ وہ اتنے بڑھتے ہوئے اخراجات کی کفالت کس طرح کرتی؟ پھر اگر شاہدہ کو کچھ بھی احساس ہوتا تو وہ اپنے ذاتی اخراجات کم کر کے آمد و خرچ کا میزانیہ درست رکھ سکتی تھی لیکن اس نے ان میں بھی کوئی کمی نہ کی۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے سعید نے قرض لیا تو قرض کی ادائیگی کی قسط سے ماہانہ آمدنی اور بھی کم ہو گئی۔ اس پر شاہدہ کا تقاضا تھا کہ وہ ایسوسی ایشن کی سکریٹری کی حیثیت سے آل ورلڈ ویمنز کانفرنس میں شرکت کے لئے نیویارک ضرور جائے گی کیونکہ وہاں النسائیت کی فلاح عام کے لئے بالعموم اور عورتوں کے حقوق و واجبات کے سلسلے میں بالخصوص مذاکرات ہوں گے ایسوسی ایشن کے پاس روپیہ نہیں تھا۔ اس نے اس نے خود ہی وہاں یہ ریزولیوشن بھی پاس کرا دیا کہ ہر نمائندہ اپنا اپنا خرچ ادا کرے۔ سعید کے لئے اتنی بڑی رقم کا مہیا کرنا ناممکن تھا۔ سعید کے پاس جو کچھ تھا وہ شاہدہ سے چھپا ڈھکا نہیں تھا۔ وہ اس کی آمد و خرچ کی پائی پائی سے واقف تھی۔ سعید نے اس سے کوئی بھی راز ہی نہیں رکھا تھا۔ تم نے طاہرہ خود کئی بار مجھ سے کہا تھا کہ سعید بھائی جان فی الواقعہ سعید ہیں۔ اس پر شاہدہ کا بگڑ کر باپ کے گھر چلے جانا اور بچیوں کو بھی ساتھ لے جانا اور پھر عدالت میں علیحدگی کی درخواست دے دینا، تم بیٹی خود ہی بتاؤ کس حد تک روا اور مناسب تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ مرد ہوتے ہی ظالم ہیں لیکن تم ہی سوچو کہ اس قصے میں سعید فی الواقعہ ظالم تھا؟ عورتیں بیچاری بیشک مظلوم ہوتی ہیں لیکن ذرا خدا لگتی کہو کہ شاہدہ پر واقعی ظلم ہو رہا تھا؟

یہ قصہ سعید اور شاہدہ ہی کا نہیں۔ یہ ہمارے نئے معاشرہ کا معمول بن رہا ہے۔ جس طرح مختلف سوسائٹیوں میں وقتاً فوقتاً بعض باتیں بطور فیشن چل نکلتی ہیں اسی طرح آج کل ہمارے ہاں "عورتوں کے حقوق" کی آواز بطور فیشن اٹھ رہی ہے میرا خیال ہے کہ میرے ان الفاظ سے (کم از کم) تم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہو جاؤ گی۔ اس لئے کہ تم تو اچھی طرح جانتی ہو کہ میں عورتوں کی مظلومیت کا کتنا بڑا نوحہ خواں اور ان کے حقوق کا کتنا بڑا مؤید ہوں۔ اور ہوں کیوں نہ، جب کہ خود قرآن عورتوں کے حقوق کا ایسا زبردست وکیل ہے۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ ہر حق اپنے مقابلہ میں ایک ذمہ داری بھی رکھتا ہے۔ ہماری خواتین (جن میں آج کل حقوقِ نسواں کا فیشن چل رہا ہے) حقوق کے لئے تو اتنے بڑے تقاضے کر رہی ہیں لیکن ذمہ داری کا ایک لفظ بھی ان کی زبان پر نہیں آتا۔ میں عورتوں کے ان تمام حقوق کے لئے جو انہیں قرآن نے دیئے ہیں۔ اور جنہیں مردوں نے اس بری طرح سے سلب اور غصب کر رکھا ہے (اور اس کے لئے آڑ بنا رکھا ہے اس شریعت کو جو ہمارے دورِ حکومت کے استبداد کی تخلیق ہے۔) پوری قوت کے ساتھ لڑنے کو تیار ہوں۔ (اور تم تو جانتی ہو کہ اس باب میں میں کب سے لکھتا چلا آ رہا ہوں) لیکن میں اس کے ساتھ اپنی بچیوں اور بہنوں کو وہ ذمہ داریاں بھی یاد دلانا چاہتا ہوں جو عورت ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔

تم مانو یا نہ مانو طاہرہ! لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دور میں (غیر شعوری طور پر) عورتوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ دنیا میں "عورت ہونا" بڑی ذلت کی بات ہے اس خیال سے ان کے دل میں ایک نفسیاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے جس کا

اظہار اس قسم کے نعروں میں ہو رہا ہے کہ عورتیں مردوں کے بالکل برابر ہیں۔ اور ہر وہ کام جو مرد کریں گے ہم بھی کریں گی۔ دیکھنے میں تو یہ نعرے بڑے انقلاب آفریں اور عورت کے مقام کو بلند کرنے کا موجب نظر آتے ہیں۔ لیکن میری پیاری بیٹی! ہماری ان بہنوں نے سمجھا ہی نہیں کہ اس قسم کے نعروں اور مطالبوں سے وہ عورت کے مقام کو کس قدر پست کر رہی ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ جو قرآن نے دورِ جاہلیت کی عورت کے متعلق کہا تھا وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ (۴۳/۱۸) کہ وہ کسی تنازع میں خود اپنے کیس کو بھی واضح طور پر بیان نہیں کر سکتی۔ ہمارے دور کی ان عورتوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔ وہ اپنا قصور ٹھہرانے کے لئے اٹھتی ہیں اور خود بھی نہیں جانتیں کہ ہمارا مدعا کیا ہے اور ہم طلب کیا کر رہی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں اپنے حقوق کا تحفظ اور مانگتی ہیں مرد کا مقام۔ یاد رکھو طاہرہ! اس کائنات میں عورت کا اپنا مقام ہے۔ وہ اگر اپنا مقام چھوڑ کر مرد کا مقام حاصل کرنا چاہتی ہے تو یہ بات اس کے لئے وجۂ فخر نہیں۔ اس سے تو الٹا مردوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ ان کا مقام واقعی بہت بلند ہے۔ جبھی تو عورتیں ان کے مقام پر آنے کا مطالبہ اور خواہش کرتی ہیں۔ فطرت کے نقشے میں عورت اور مرد کے مقام میں فرق نہیں ان کے فرائض میں فرق ہے۔ فرائض کا یہی فرق ہے جس کے لئے ان دونوں کی ساخت میں حیاتیاتی اختلاف (BIOLOGICAL DIFFERENCE) ہے یہی وہ اختلاف ہے جس کی وجہ سے عورت کی زندگی کا ایک حصہ عملی کاموں سے معذوری میں گزرتا ہے۔ مثلاً ایام حمل، زچگی، رضاعت کے دن۔ اس معذوری کے یہ معنی نہیں کہ اس سے عورت کا درجہ مرد کے مقابلہ میں پست ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھو تو عورت کا مقام مرد کے مقابلہ میں اونچا ہوتا ہے۔ عورت اگر چاہے تو (ان معذوریوں کے باوجود) ہر وہ کام کر سکتی ہے جسے مرد کر سکتے ہیں لیکن مرد اگر ہزار چاہے تو بھی وہ ان امور کو سرانجام نہیں دے سکتا جسے عورت کی معذوریاں سرانجام دے سکتی ہیں۔ عورت اگر مردوں کے فرائض سرانجام دینے کا مطالبہ کرتی ہے تو اس سے نہ صرف اپنے مقام ہی کو کم کرتی ہے بلکہ فطرت کے نقشے کو بگاڑنے اور اس کے پروگرام کو تہ و بالا کر دینے کا بھی اعلان کرتی ہے اس لئے کہ اگر یہ مردوں کے کام کرنے لگ جائیں تو اس کے فرائض کو کون سرانجام دے گا؟ (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔) مرد تو اس کے فرائض سرانجام دینے کے قابل ہی نہیں پیدا کیا گیا۔ یاد رکھو بیٹی! عورت شجرِ انسانیت میں برگ و بار پیدا کرنے کا موجب اور نسلِ انسانی کے زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ اگر یہ اپنی اس خصوصیت کو نگہِ حقارت سے دیکھتی اور اپنے ان فرائض کی تکمیل میں عار محسوس کرتی ہے تو یہ فطرت کے نقشے میں بگاڑ پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ (حقوق مانگتی مانگتی) اپنے آپ کو اس اطمینان سے بھی محروم کر چکی ہے جو اسے فطرت کے متعین کردہ فرائض کی سرانجام دہی سے حاصل تھا اور آج عجیب قسم کی نفسیاتی کشمکش میں گرفتار ہو چکی ہے یعنی یہ اس حیاتیاتی فرق (BIOLOGICAL DIFFERENCE) کو مٹا سکنے پر تو قادر نہیں جو اس کی ساخت کے اندر داخل ہے۔ لیکن اسے قابلِ نفرت اور مرد کی ساخت کو قابلِ فخر سمجھ کر اس نے اپنے لئے عدمِ سکون کا جہنم تیار کر لیا ہے۔ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو طاہرہ! کہ عورت، عورت ہونے کی حیثیت سے ہزار عزتوں کی مستحق اور لاکھ عظمتوں کی سزاوار ہے اور اگر وہ اپنے عورت ہونے پر عار محسوس کرتی ہے تو اس سے زیادہ حرماں نصیب اور بدقسمت اور کون ہوگا! اگر وہ مرد بننے کے چاؤ میں اپنی پیشانی کا عالمتاب نور اور اپنے سینہ کی انسانیت ساز حرارت کھو بیٹھتی ہے تو اس سے بڑھ کر اس کی نہیں بلکہ خود (نوعِ انسان) کی شوریدہ بختی کیا ہوگی؟ یاد رکھو طاہرہ! انسانیت کی تشکیل میں گھر (HOME) کی حیثیت بڑی بنیادی اور خاندان (FAMILY) کا مقام بڑا اساسی ہے۔ جو معاشرہ اس اساس و بنیاد کو قائم نہیں رکھتا (جیسا کہ آج کل یورپ میں بالعموم اور روس میں بالخصوص ہو رہا ہے) وہ آنے والی نسلوں کو آوارہ اور بے مرکز بناتا ہے۔ گھر اور خاندان کی تاسیس و تشکیل میں عورت کی حیثیت مرکزی ہے۔ گھر کو جنت اور آنے والی نسلوں کو باوقار انسان بنانے میں اس کا بڑا حصہ ہے اگر عورت اپنے اس اہم اور قابلِ فخر فریضہ کو چھوڑ کر مردوں کے فرائض سنبھالنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ معاشرہ اور انسانیت پر ظلم کرتی ہے۔ تم اس سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عورت کسی ایسے کام میں شریک ہی نہ ہو جو آج کل مردوں کی تفویض میں ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عورت کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے اولین فرائض کو سرانجام دے۔ اور جب اسے ادھر اطمینان ہو جائے تو پھر بیشک مردوں کے دوش بدوش جہادِ زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی شریک ہو۔ ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم جو بھی قدم اٹھاتے ہیں یورپ کی نقالی میں اٹھاتے ہیں اور اس سے بھی بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم نقالی بھی اس وقت کرتے ہیں جب خود یورپ اپنے اس اقدام کے تلخ نتائج سے تنگ آکر اسے چھوڑنے کی فکر کر رہا ہوتا ہے۔ یورپ میں عورتوں نے مردوں کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا۔ اور اپنی حقوق طلبی کے لئے مظاہرے شروع کئے۔ یہ درحقیقت ردِعمل تھا عیسائیت کی اس تعلیم کا جس کی رو سے عورت کو ذلیل ترین مخلوق تصور کیا گیا تھا۔ عیسائیت کی تعلیم یہ تھی کہ عورت کو مرد کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور پسلی کی ہڈی کی طرح ٹیڑھی ہوتی ہے (جو کبھی سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اور اسے سیدھا کرنے کی کوشش کرو تو یہ ٹوٹ جاتی ہے۔) دنیا کی تمام مصیبتوں کا موجب عورت ہے کیونکہ اس نے آدم کو بہکا کر جنت سے نکلوایا تھا۔ روح صرف مرد کے لئے مخصوص ہے عورت میں (جانوروں کی طرح) روح ہی نہیں ہوتی۔ اس تعلیم کا لازمی ردِعمل تھا کہ عورتیں مرد بننے کی کوشش کرتیں۔ اس کوشش کا پہلا زینہ یہ تھا کہ وہ ان فرائض کو چھوڑ دیتیں جو بحیثیت عورت انہیں سرانجام دینے پڑتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان تمام اجزاء کو ایک ایک کر کے توڑنا شروع کر دیا جن کے مجموعہ سے گھر (HOME) ترتیب پاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ ایسی صورت پیدا کر دی کہ گھر اور ہوٹل میں کوئی فرق ہی نہ رہا۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ گھروں میں کھانا پینا بند ہو گیا مطلب یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں مودت اور یگانگت کا وہ تعلق نہ رہا، جسے قرآن نے ھُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ سے تعبیر کیا ہے۔ تعلق محض کاروباری (BUSINESS) کا سا رہ گیا۔ اولاد کا (اوّل تو) تصور ہی باردوش ہو گیا۔ اور جو بچے پیدا ہوئے وہ سینہ مادر کی محبت آمیز گرمجوشیوں اور اس کے آغوش کی انسانیت ساز سبق آموزیوں سے محروم رہ گئے۔ حال ہی میں یورپ کے علمائے نفسیات ایک طویل تجربے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جو بچے تین برس کی عمر تک اپنی ماؤں سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے ان کا بیشتر حصہ جوان ہو کر آوارہ اور جرائم پیشہ ہو گیا۔ چنانچہ یورپ اب اپنی غلطی سے عبرت حاصل کر کے آہستہ آہستہ پھر گھر کی زندگی کی طرف واپس آ رہا ہے لیکن ہمارے ہاں "خانہ ویرانی" کی اس اسٹیج کی ابتدا ہو رہی ہے جہاں سے یورپ کی عورتوں نے اس بغاوت کا آغاز کیا تھا۔ غالباً تم نے اخبارات میں پڑھا ہوگا کہ جب پچھلے دنوں فروری کے اخیر میں اپوا کے زیرِ اہتمام کراچی میں "حقوقِ نسواں" کی بہت بڑی کانفرنس ہوئی ہے تو ہمارے ہاں کی خواتین تو اس پر زور دیتی رہیں کہ ہمیں ملازمتوں میں اتنا حصہ ملنا چاہیئے۔ اور اسمبلیوں میں اتنی نشستیں اور امریکہ کی نمائندہ نے (MRS. LESLIE WYMAN) نے اپنی تقریر میں کہا کہ

"پاکستان کی عورتیں بڑی خوش قسمت ہیں اس لئے کہ ان کے حقوق کو اسلامی قوانین نے پہلے ہی سے متعین کر رکھا ہے اب جو کچھ ان کا مطالبہ ہے وہ فقط ان حقوق کی توثیق ہے۔ جب انھوں نے ان حقوق کی توثیق حاصل کر لی تو اس کے بعد ان کے لئے بہت بڑا کرنے کا کام ہوگا۔

عام طور پر مخاطبین نے سمجھا ہوگا کہ اب یہ مغربی خاتون کہے گی کہ کرنے کا کام یہ تھا کہ دفاتر میں یہ کچھ کیا جائے گا اور اسمبلیوں میں پہنچ کر یہ کچھ۔ لیکن اس نے یہ کہا اور نہ وہ بلکہ کہا یہ کہ

"ان کا حقیقی کام یہ تھا کہ یہ آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت کو صحیح قالب میں ڈھال دیں۔ عورت کے لئے بچوں کی ماں اور گھر کی بیگم سے زیادہ نہ کوئی کام محنت طلب اور اہم ہے اور نہ ہی ایسا جو اجر اور معاوضے کے اعتبار سے ان کاموں سے بہتر ہو۔"

تم نے دیکھا طاہرہ کہ مغرب کی عورت کیا کہہ رہی ہے۔ اور ہمارے ہاں سے کیا آوازیں بلند ہو رہی ہیں یہ اس لئے کہ مغرب کی عورت ذاتی تجربے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے۔ اور ہمارے ہاں سے یہ آوازیں بالعموم بلاسوچے سمجھے بلند ہو رہی ہیں۔

پھر ایک بات اور بھی دلچسپ ہے۔ ہمارے ہاں سے بات کی تمہید تو اس طرح کی ہوتی ہے کہ عورتوں پر مرد بے حد ظلم کرتے ہیں۔ وہ دھڑا دھڑ شادیاں کرتے جاتے ہیں۔ پہلی بیوی کو ادھر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بیچاری بھوکوں مرتی ہے۔ اس کے بچے تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ لڑکیوں کا مہر ادا نہیں ہوتا۔ ان کے نان نفقے کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا اور اس کی تان جا کر اس مطالبہ پر ٹوٹتی ہے کہ عورتوں کو ملازمتوں میں اتنا حصہ ملنا چاہیئے۔ ان کے لئے اسمبلیوں میں اس قدر نشستیں مخصوص ہونی چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ جن عورتوں پر ظلم و ستم ہو رہا ہے ان میں سے کوئی بھی اس قابل نہ ہوگی کہ وہ دفتروں میں ملازمت حاصل کر سکے۔ یا اسمبلی کی ممبر بن سکے۔ اور جو ملازمتیں حاصل کر سکیں گی یا اسمبلیوں میں جائیں گی ان میں بمشکل کوئی ایسی ہوگی جو مظلوم اور مصیبت زدہ ہو۔ ان کے اسمبلیوں میں جانے سے ان مظلوموں کی حالت کبھی نہیں سدھر سکے گی۔ تم جانتی ہو کہ میں عورتوں کے اسمبلیوں میں جانے کے خلاف نہیں ہوں۔ لیکن جو عورت اپنے طبقہ کے حقوق کی محافظت کے لئے آگے بڑھے (خواہ وہ لیڈری کا میدان ہو یا اسمبلی کا ایوان) اس کے متعلق سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس نے اپنے گھر کی حالت سدھارنے اور سنوارنے کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ اپنے میاں کے ساتھ اس کے تعلقات کیسے ہیں؟ وہ اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے کتنا وقت دیتی ہے۔

اس نے عورتوں کے غریب اور مظلوم طبقے کے اندر کتنا وقت گزارا ہے۔ اور ان کے مصائب کے حل کے لئے عملاً کیا کچھ کیا ہے۔ پھر سن لو کہ دیکھنا یہ ہوگا کہ اس نے اس مقصد کے لئے عملاً کیا کچھ کیا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ہاں لیڈروں اور نمایندوں کا کام تقریریں کرنے، بیانات دینے اور ریزولیوشن پاس کرنے کی حد سے آگے کبھی نہیں بڑھتا۔ تمہیں ان باتوں کے متعلق زیادہ وضاحت سے لکھنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ یہ وہ باتیں ہیں جنہیں تم خود شاہدہ سے کہا کرتی تھیں کہ وہ دعویٰ تو کرتی ہے سارے معاشرے (بلکہ انسانیت) کو سدھارنے اور سنوارنے کے اور خود اس کے اپنے گھر کی یہ حالت ہے۔ وہ پروگرام تو بتاتی ہے آنے والی پوری نسل کی صحیح پرورش، تعلیم اور تربیت کا۔ اور خود اپنی حالت یہ ہے کہ بچوں کو کبھی پوچھا تک بھی نہیں کہ وہ کیا کرتے ہیں اور کیا پڑھتے ہیں۔ وہ دنیا جہان کی عورتوں کو خاوند کو رام کرنے کے طریقے بتاتی ہے اور خود سعید جیسے خاوند کے ساتھ بھی نباہ نہیں کر سکی۔ وہ اپنے مضامین میں مظلوم اور ستم رسیدہ عورتوں کی بتیا پر آنسو بہاتی ہے لیکن حرام جو اسے اس کا بھی علم ہو کہ جن مظلوموں کی دکھ بھری داستانوں کے وہ افسانے لکھتی ہے وہ رہتی کہاں ہیں۔ وہ دوسروں کو شرم دلاتی ہے کہ ان کی بیٹیوں اور بہنوں کے بتر ڈھانپنے کو کپڑہ تک میسر نہیں اور خود (اپنے لئے ہی نہیں) اپنے کتوں کے لئے بھی حریم واطلس کے گدے بنواتی ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں طاہرہ جو تم خود شاہدہ سے کہا کرتی تھیں۔ اس کے بعد تم خود ہی سوچو کہ شاہدہ کی اس قسم کی اپنی زندگی کا انجام کیا ہو سکتا تھا اور جن کی فلاح و بہبود کے لئے وہ انجمنیں بنایا کرتی تھی ان کی حالت سدھارنے کی کیا شکل ہو سکتی تھی۔ یاد رکھو بیٹی معاشرہ کی حالت کو وہی سدھار سکتا ہے جو (دوستوں اور مداحوں سے نہیں بلکہ) دشمنوں کے بھرے مجمع سے پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکے کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۱۰/۱۶)

یعنے تمہارے اندر اپنی پوری عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں سمجھ سکتے کہ میں اپنے دعووں میں سچا ہوں یا جھوٹا۔

جو ایسا کر سکنے کی ہمت نہیں رکھتا اس کی نہ تو اپنی زندگی کا میاب گزر سکتی ہے اور نہ ہی وہ معاشرہ میں کوئی انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ جب تک ہماری قوم کی "شاہدہ" خود اپنی اور اپنے گھر کی حالت کی شاہد نہ ہوگی وہ شہداء علی الناس کبھی نہیں بن سکے گی۔

وَذَالِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ۔

بیٹی تمہاری سسکیوں کا مجھے احساس ہے لیکن حقائق سسکیوں سے نہیں بدلا کرتے۔ یہ خط عجلت میں لکھ رہا ہوں تفصیل سے پھر کبھی لکھوں گا۔ اچھا خدا حافظ۔ جاوید میاں سے دعا کہنا اس کا اچھی طرح خیال رکھا کرو۔

پرویز

ہاشمی سلطنت اردن

ماضی، حال، مستقبل

شاہ حسین جو ان دنوں وارد فرمائے پاکستان ہیں، پانچویں مسلمان رئیس مملکت ہیں جو ہمارے مہمان ہو چکے ہیں۔ اس سے پیشتر شاہ ایران، شاہ عراق، شاہ سعودی عربیہ اور صدر جمہوریہ ترکیہ یہاں تشریف لا کر اس احساس وحدت کا مظاہرہ کر چکے ہیں جو مسلمانوں کے اعماقِ قلوب میں جاگزیں ہے اور جو آہستہ آہستہ سیاسی رفاقت اور دفاعی تعاون کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ اردن جو اب ہاشمی سلطنت اردن کہلاتا ہے شرق اردن کے نام سے موسوم و معروف تھا۔ اردن اس دریا کا نام ہے جو اس ملک میں شمالاً جنوباً بہتا ہوا بحر مردار میں آ گرتا ہے اور اسے فلسطین سے جدا کرتا ہے۔ اس علاقہ کا شرق اردن کے نام سے موسوم ہونا ہی اس کی دلیل ہے کہ اس کا تشخص اضافی تھا نہ کہ ذاتی۔ اور دیکھا جائے تو ایک ملک کی حیثیت سے اس کی زندگی تیس پینتیس سال سے زیادہ نہیں۔ تاریخ میں عملاً یہ شام کا حصہ رہا ہے اور اس طرح ان سلطنتوں کے زیر فرمان جو ان علاقوں میں مرور زمانہ کے ساتھ ابھرتی رہیں کوئی ڈھائی ہزار سال پہلے یہ سلطنت اسرائیل کے تابع تھا اس کے بعد ایک عربی قبیلہ یہاں آکر آباد ہو گیا۔ اور آزادانہ حکومت کرتا رہا تا آنکہ چوتھی صدی قبل مسیح میں اس کا شمالی حصہ شام کی یونانی سلطنت کے تحت آ گیا۔ روما کا عروج ہوا تو یہ علاقے رومی سلطنت کے تابع فرمان ہو گئے۔ اس کے زوال پر ایک عجیب دور فوضیت طاری ہو گیا۔ جس میں بازنطینی، ایرانی اور مقامی حکمرانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بالآخر مسلمان آئے اور شرق اردن مسلمان ہو کر اسلامی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

قومی تشخص

اس دوران میں شرق اردن کی جداگانہ حیثیت قابل ذکر نہیں رہی۔ یہ عموماً شام کا حصہ رہا اور قریباً مصر سے اس پر حکومت کی جاتی رہی۔ سولھویں صدی میں اسے سلطنت عثمانی کی ولایت دمشق میں شامل کیا گیا۔ جب پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو اس وقت بھی شرق اردن خوابیدہ سا تھا۔ اور گمان تک بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ اس کے زیر سطح لاوا تیار ہو رہا ہے۔ ضمناً لاوا ان علاقوں کے خمیر میں ہے۔ اردن، مغربی شام، شمالی ترکی، ایران وغیرہ میں زمین کی سطح لاووں کے پھوٹ پھوٹ کر بہتے رہنے سے بنی ہے۔ بعض جگہ یہ ٹکڑوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور پہاڑ سے بن جاتے ہیں۔ اور بعض جگہ مثلاً اردن میں اس کے تختے زمین پر بچھ جاتے ہیں۔ لاووں کی بدولت ان علاقوں میں زلزلے وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں کبھی کبھی ان میں (ترکی اور ایران میں مثلاً) نقصان جان بھی ہو جاتا ہے اسی لاوے نے ان کی زمینوں کو ویران اور ناقابل زراعت بنا رکھا ہے۔

یہ ذکر تو اس طبعی لاوے کا ہے جو آتش فشاں پہاڑوں سے پھوٹتا ہے لیکن جنگ عظیم کے دوران میں جو لاوا یہاں پھوٹا وہ سیاسی تھا۔ اقوام مغرب ایک عرصے سے ترکی کے اسبابِ زوال کے دبے ہوئی تھیں۔ جنگ عظیم میں جب عثمانی سلطنت کا نظام اندرونی اضمحلال کی بدولت بوسیدہ ہو چکا تھا، انھیں اپنے مقاصد کی تکمیل کا ایک عمدہ موقع میسر آگیا۔ اس کے لئے عربوں کو خاص طور پر ترکوں کے خلاف آمادہ بغاوت کیا گیا۔ عرب کی سرزمین میں وحدت اور آزادی کا سبز باغ اٹھا کر وطنیت کا بیج بو یا گیا۔ ۱۹۱۶ء کے سائیکس۔ پکٹ معاہدہ[1] کی رو سے شرق اردن اور گرد و نواح میں برطانوی اقتدار تسلیم کر لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ نومبر ۱۹۱۷ء کے رسوائے عالم بالفور اعلان کی یہودیوں نے یہ تعبیر کی کہ شرق اردن بھی ان کے قومی گھر میں شامل ہے۔ جنگ کے خاتمے پر موجودہ اردن فیصل ابن حسین شاہ حجاز کے تصرف میں تھا۔ برطانیہ اور فرانس کی حوصلہ افزائی پر فیصل نے دمشق میں حکومت … کی داغ بیل رکھی۔ ان کے پیش نظر اتحادیوں کے مواعید آزادی تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں پیرس کے مقام پر جو صلح کانفرنس منعقد ہوئی اس میں انھوں نے عربی آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ برطانیہ اور فرانس جو در اصل عربی بغاوت کی پشت پر تھے لیکن جن کا مقصد محض ترکوں کو نیست و نابود کرنا تھا اس کی تاب نہ لا سکے۔ ایک سال بعد یعنی ۱۹۲۰ء میں دمشق میں شامی کانگریس کا انعقاد ہوا جس نے شام اور عراق کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ شام کی حکومت فیصل نے سنبھالی اور عراق کی عبداللہ نے جو حسین کے دوسرے بیٹے تھے۔

آزاد حیثیت

اب فرانس اور برطانیہ آگے بڑھے۔ مارچ میں دمشق کانگریس نے اعلان آزادی کیا تو اپریل میں برطانیہ نے فلسطین کو عربی علاقوں سے علیحدہ کر کے اپنے انتداب میں لے لیا۔ شام پر فرانس نے قبضہ کر لیا اور فیصل کو بے دخل کر دیا۔ اس سلب و غصب میں شرق اردن کا معاملہ کچھ صاف نہ ہوا۔ برطانیہ نے اسے فلسطین کے انتداب میں شامل کر لینا چاہا اور ۱۹۲۰ء میں فرانس سے معاہدہ کر کے فلسطین کی حدود کو شرق اردن تک پھیلا دیا۔ لیکن یہ توسیع عارضی ثابت ہوئی مارچ ۱۹۲۱ء میں قاہرہ میں ایک اور کانفرنس ہوئی۔ اس میں چرچل اور لارنس بھی شریک تھے۔ قاہرہ میں یہ طے کیا گیا کہ فیصل کو عراق کا بادشاہ بنا دیا جائے اور عبداللہ کو شرق اردن پر فائز

---

[1] یہ معاہدہ برطانیہ، فرانس اور روس کے مابین طے پایا تھا۔ اس کا مقصد ترکی سلطنت کی تقسیم اور اپنے اپنے حلقہ ہائے اقتدار کا تعین تھا۔ اس سے میسو پوٹیمیا اور بحیرہ روم کے مشرقی ساحلی علاقے برطانیہ کی نذر ہوئے۔ یہ معاہدہ ان عربوں سے مخفی رکھا گیا تھا جنہیں آزادی کا سبز باغ دکھا کر ترکوں کے خلاف

نوادرات

از علامہ اسلم جیراجپوری　　　قیمت چار روپے

کرایا جائے۔ عبداللہ اس زمانہ میں شام کو فرانس سے آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف تھے اور ان کا شرق اردن پر پورا تصرف ہو چکا تھا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۲۱ء میں انہیں شرق اردن کا حکمران تسلیم کر لیا گیا۔ گو لیگ آف نیشنز کے جولائی ۱۹۲۲ء کے فیصلہ کی رو سے شرق اردن بھی فلسطینی انتداب میں شریک کر لیا گیا۔ لیکن ستمبر میں یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ یہ علاقہ "یہودی گھر" کی زد میں نہیں آئے گا۔

۱۵ مئی ۱۹۲۳ء کو برطانیہ نے شرق اردن کو ایک آزاد آئینی مملکت کے طور پر باقاعدہ تسلیم کیا۔ اس کے باوصف شرق اردن برطانیہ کے زیر اثر تھا۔ بہرحال اس سے اس کا تشخص قائم ہو گیا۔ اور ایک مملکت معرض وجود میں آ گئی۔ شرق اردن کی حدود ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئی تھیں کہ حجاز میں ابن سعود نے عبداللہ کے والد حسین کا تخت الٹ دیا۔ ابن سعود کی فوجیں شرق اردن کی حدود میں بھی داخل ہو گئیں۔ جون ۱۹۲۵ء میں یہ فوجیں واپس آئیں تو عبداللہ نے اپنی حدود معان اور عقبہ تک بڑھا لیں۔ ابن سعود نے بھی ان سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ ۱۹۴۸ء میں فلسطین سے برطانوی انتداب ختم ہوا تو عبداللہ نے دریائے اردن سے پار کے متعدد علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اور اسے باقاعدہ طور پر اپنی مملکت میں شامل کر کے ملک کا نام شرق اردن سے بدل کر اردن رکھ دیا۔ ۲۵ مئی ۱۹۴۶ء کو امیر عبداللہ کو باقاعدہ بادشاہ تسلیم کر لیا گیا یہی اس ملک کا یوم آزادی متصور ہوتا ہے۔

شاہ عبداللہ ۲۰ جولائی ۱۹۵۱ء کو قتل ہو گئے تو ان کے صاحبزادے طلال سریر آرائے سلطنت ہوئے لیکن وہ اپنے صاحبزادے حسین کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ ہمارے مہمان شاہ حسین ۱۱ اگست ۱۹۵۲ء کو تخت پر بیٹھے۔ چونکہ ان کی پیدائش ۲ مئی ۱۹۳۵ء کو ہوئی اس لئے قاعدے کے مطابق ۱۸ سال کی عمر پر ۲ مئی ۱۹۵۳ء کو باقاعدہ طور پر ان کی تاجپوشی ہوئی۔

اردن کا مقام و منصب

اس پس منظر میں مشرق وسطیٰ اور عالمی سیاست میں اردن کا مقام و منصب دیکھا جا سکتا ہے۔ قومی تشخص حاصل کر لینے کے بعد اردن مغرب سے بھی وابستہ رہا۔ اور عربوں کی سیاست پر بھی اثر انداز ہوتا رہا۔ دس سال پیشتر عرب لیگ معرض وجود میں آئی تو اس کی تشکیل میں اردن کا نمایاں ہاتھ تھا۔ اس اعتبار سے اردن مغرب اور عربوں کے مابین ایک رابطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اب جبکہ عرب من حیث المجموع اپنی تنظیم کی فکر میں ہیں اور مغرب سے تعلقات استوار کر رہے ہیں اردن کا منصب اہم تر ہو جاتا ہے۔ قرائن شاہد ہیں کہ اردن اس نازک ذمہ داری سے حتی المقدور عہدہ برآ ہو رہا ہے۔

دیگر ممالک عرب کی طرح اردن کی مشکلات دوگونہ ہیں۔ ایک افلاس، دوسری فوجی کمزوری۔ وہ ان دونوں ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اقوام مغرب کا محتاج ہے۔ یہ غنیمت ہے کہ اس کے حکمرانوں نے بڑی دانشمندی سے ہر موقع کا فائدہ اٹھایا ہے اور مناسب مدد حاصل کرنے میں کبھی لیت و لعل سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اردن ایسا عربی ملک ہے جس کے پاس ۱۸ ہزار منظم اور تربیت یافتہ سپاہ ہے۔ جس کے مقابلہ میں لبنان اور شام کے پاس کوئی قابل ذکر فوج نہیں۔ وہ اس کے علاوہ برطانیہ، امریکہ اور اقوام متحدہ سے متفرق طریقوں سے مالی مدد بھی لے رہا ہے۔

زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ کرنل ناصر نے شاہ اردن کو دو سنہری پستول بطور تحفہ پیش کئے۔ اس کے فوراً بعد ترکی پارلیمان نے فوجی ہوائی جہاز اردن کو پیش کرنے کی قرارداد منظور کی۔ یہ تحفہ اس مہینے میں موصول ہو گا۔ یہ دو معمولی واقعات بتا دیتے ہیں کہ اردن کا راستہ کدھر ہو گا۔ مصر جس کی انتہائی کوشش ہے کہ دیگر ممالک عربیہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں کسی عربی ملک کی اس سے زیادہ مدد نہیں کر سکتا کہ اسے بھی دو ایک محض پستول دے سکے۔ اس کے برعکس ترکی اس قابل ہے کہ وہ ہوائی جہاز دے سکے۔ اردن اس راز کو خوب سمجھتا ہے چنانچہ وہ اپنا فیصلہ کر چکا ہے۔ کرنل ناصر نے جنوری میں عراق کے خلاف جو طوفان اٹھایا اس کو ناکام بنانے میں اردن نے قابل قدر حصہ لیا۔ اردن کا رجحان نمایاں طور پر مغرب، ترکی، اور پاکستان کی طرف ہے۔ اور اب وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی عراق کی طرح ان ممالک سے معاہدہ کرے گا۔ شاہ حسین کی تشریف آوری کو اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ وہ وقت دور نہیں کہ ترکی، اردن، عراق، ایران اور پاکستان ایک ہی سلسلہ میں منسلک ہوں گے۔ جوں جوں یہ رشتے مستحکم ہوتے جائیں گے دشمنان وحدت کے حوصلے پست ہوتے جائیں گے۔ اور عالم اسلامی بین الاقوامی سیاست میں ایک موثر عنصر کی حیثیت اختیار کرتا جائے گا۔ ولو کرہ المشرکون۔

دو اہم نکات

اس وقت اقوام مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دو اہم نکات کو ہمیشہ سامنے رکھیں۔ ایک تو یہ کہ ان مختلف اقوام میں ماضی میں جو تنازعات اور آویزشیں رہی ہیں انہیں بھلا کر نگاہ کو مستقبل پر رکھا جائے۔ دوسرے یہ کہ اب جبکہ ساری دنیا رفتہ رفتہ ایک وحدت بنتی جا رہی ہے یہ بھی اپنے تشتت و انتشار کو ختم کر کے وحدت کی طرف قدم اٹھائیں ان کی وحدت کی بنیادی اینٹیں تو آج سے چودہ سال پہلے "معمار عرب" کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی تھیں فقط اس بنیاد پر عمارت استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ وہ عمارت جو بیک وقت رحماء بینہم بھی ہو اور اشداء علی الکفار بھی۔ وکان ذالک علی اللہ یسیرا۔

ماہنامہ طلوع اسلام
کے
پرانے پرچے
۱۹۴۸ء سے لیکر جنوری ۱۹۵۵ء تک کے بعض پرچے دفتر میں موجود ہیں جو بزم ہائے طلوع اسلام کو چوتھائی قیمت پر اور دیگر اصحاب کو آدھی قیمت پر دے دیئے جائیں گے۔ اس رعایت سے ۳۰ اپریل تک فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔
ناظم ادارہ طلوع اسلام پوسٹ بکس ۱۳۵ کراچی

بزم طلوع اسلام

مقام مسرت ہے کہ طلوع اسلام کے قارئین رابطہ باہمی کی ضرورت و افادیت کو محسوس کرتے ہوئے جگہ بہ جگہ بزم ہائے طلوع اسلام قائم کر رہے ہیں۔ یہ آثار بڑے خوش آیند ہیں اور اس کی بین شہادت کہ جس قرآنی فکر کو پیش کیا جا رہا ہے وہ دلوں میں اترتا ہی نہیں جا رہا بلکہ وہ ذکل بن کر اعماق قلوب سے ابھرتا بھی جا رہا ہے۔ یہی وہ تغیر ہے جو اندر اندر پرورش پاتا رہتا ہے اور بالآخر خارج میں متشکل ہو جاتا ہے۔ یہ منزل کہ جس میں اندر اندر تو تغیر ہو رہا ہوتا ہے لیکن خارج میں اس کا قابل ذکر مظاہرہ نہیں ہوتا اس اعتبار سے صبر آزما ہوتی ہے کہ سمجھ یہ لیا جاتا ہے کہ کچھ ہو ہی نہیں رہا۔ حالانکہ آگے چل کر جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور جسے عام اصطلاح میں انقلاب کہا جاتا ہے وہ اسی اندرونی تغیر کے بغیر ناممکن ہوتا ہے۔ لہذا ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ بیشتر توجہ شعور کی بیداری اور فکر کی ترویج و اشاعت پر صرف کی جائے۔ بزم ہائے طلوع اسلام کے لئے اس کی عملی شکل یہ ہو گی کہ وہ مقامی طور پر ایک دارالمطالعہ قائم کریں اور اس کی وساطت سے اپنے لٹریچر کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچائیں۔ ایسے دارالمطالعہ ہماری فکری تحریک کے زندہ مراکز ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور ملت میں تازہ زندگی پھونک دینے کی ضمانت۔ ان کا نام "دارالمطالعہ طلوع اسلام" یا "طلوع اسلام لائبریری" رکھنا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ اسے صحیح معنوں میں ایک اعلیٰ پایہ کی لائبریری بنایا جا سکتا ہے اور علاقے بھر کو علم کی روشنی سے منور کیا جا سکتا ہے۔

یہ سوال جگہ جگہ سے پوچھا جا رہا ہے کہ ہم طلوع اسلام کی مدد کس طرح کر سکتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ طلوع اسلام کی مدد دو طرح کی جا سکتی ہے اول یہ کہ اس کے پیش کردہ فکر کو ہر ممکن طریق سے عام کیا جائے۔ اس کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے اور انہیں زیادہ سے زیادہ طلوع اسلام سے وابستہ کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اگر مقامی طور پر ممکن ہو تو طلوع اسلام کے لئے اشتہار مہیا کئے جائیں۔ مالی اعتبار سے اخبارات کی زندگی کا دارومدار اشتہارات کی آمدنی پر ہوتا ہے۔ طلوع اسلام کی آمدنی کی یہ مد بمنزلہ صفر ہے۔ اب چونکہ مصارف بڑھ گئے ہیں۔۔۔ ویسے طلوع اسلام شروع ہی سے خسارے میں چل رہا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اشتہارات حاصل کر کے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ جو قارئین اس سلسلہ میں کچھ کر سکتے ہیں وہ مزید تفصیلات ناظم ادارہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

پاک پٹن غلام محی الدین صاحب۔ نائب تحصیلدار پاک پٹن ضلع منٹگمری اطلاع دیتے ہیں کہ وہ مقامی طور پر بزم کی تشکیل کے لئے کوشاں ہیں۔ لہذا قارئین سے التماس ہے کہ ان سے رابطہ پیدا کریں۔

سیالکوٹ بزم طلوع اسلام سیالکوٹ نے یہ قرارداد منظور کی ہے کہ محترم پرویز صاحب کے جو خطبات ان کے مکان واقعہ ۲۳/۱ قادر لائن نمبر ۲ بارکس میں اتوار کو صبح ۹ بجے ہوتے ہیں ان کے ضروری اقتباسات طلوع اسلام میں شائع کئے جائیں۔ یہ تجویز معقول ہے اور کراچی کی بزم اس سلسلہ میں مناسب انتظامات بھی کر رہی ہے وہ ایک شارٹ ہینڈ رائٹر کی تلاش میں ہے جو خطبے کے نوٹ لے سکے۔ جونہی یہ انتظام ہو گیا خطبات

نقد و نظر

"نقوش" شخصیت نمبر

ادارۂ فروغِ ادب لاہور کے ماہنامہ نقوش نے اپنا ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے "شخصیت نمبر"۔ یہ ایک ماہنامہ کا خاص نمبر کیا ہے۔ سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی ایک ضخیم کتاب ہے۔ (قیمت چھ روپے) جس میں اردو کے چھیاسی ادبار اور شعراء کے کوائفِ حیات مختلف حضرات سے لکھوا کر جمع کئے گئے ہیں۔ ہمارے اس دور میں اتنے مختلف لکھنے والوں سے اتنے مضمون اکٹھے کر لینا ہی کچھ آسان کام نہ تھا۔ جو ان مضامین کو سات سو صفحات کی ضخیم تالیف میں یکجا کر کے شائع کرنے کی بھی ہمت کر لی گئی۔ اس مجموعہ میں بہت سی ایسی شخصیتوں سے خاصا تعارف ہو جاتا ہے جن کے نام تو اکثر سُنے تھے لیکن جن کے متعلق کچھ تفصیل سے معلوم کرنے کو جی چاہتا تھا۔ اس لحاظ سے ادارۂ فروغِ ادب کی یہ کوشش درخورِ ستائش ہے۔ ان شخصیتوں میں سرسید، اقبال اور ابوالکلام آزاد سے لے کر دیوندر ستیارتھی، راجندر سنگھ بیدی اور میراجی تک کے اہلِ قلم سب موجود ہیں۔ چونکہ ادارہ "ترقی پسند ادب" کا نقیب ہے اس لئے اس کی محفل میں اس انداز کے لکھنے والوں کی اکثریت ہونی چاہیئے تھی لیکن اس کے باوجود دیگر اربابِ قلم کے بارے میں اس نے کوئی بخل نہیں برتا۔

سوانح نگاری (BIOGRAPHY) ایک مشکل صنفِ تحریر ہے۔ اور یہ کہنے اور ماننے میں ہمیں کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیئے کہ اس باب میں ابھی اردو انگریزی سے بہت پیچھے ہے۔ پیشِ نظر مجموعہ میں کچھ تعارف نامے تو محض "آپ کا نام۔ باپ کا نام۔ کہاں سے آئے۔ کہاں جاؤ گے" قسم کے سوالات کے جواب ہیں لیکن بعض مضامین علمی اور ادبی اعتبار سے خاصے اونچے ہیں۔ ان میں جو مضمون (ہمارے نزدیک) شخصیت نگاری کی سب سے زیادہ خوبیاں اپنے اندر لئے ہیں وہ فیض کے متعلق (ان کی رفیقۂ حیات) ایلس فیض کا ہے۔ کیا اس کی بھی کہیں یہی وجہ نہیں کہ مضمون نگار ایک انگریز خاتون ہیں۔

ایک چیز ہمارے لئے بیک وقت "تالیف اور مسرت" کا موجب ہوئی۔ فہرست میں "نیاز فتحپوری" کے عنوان کے سامنے مقالہ نگار کا نام "ابوالخیر مودودی" لکھا تھا۔ ہم محترم ابوالخیر مودودی صاحب کے متعلق یہ جانتے تھے کہ وہ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے برادرِ کلاں ہیں۔ پہلے حیدر آباد (دکن) میں دارالترجمہ میں کام کرتے تھے اور آجکل ترجمان القرآن کے پبلشر ہیں۔ اس خیال سے ہمارے دل کو دھکا سا تھا کہ نیاز جیسا علامۂ قلم اور علمی رقم ادیب اور اسے شخصیت نگار ملا ایک جامد یا ایسی مولوی! ہمیں، وہ کہ نیاز بیچارے کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔ اور ادارۂ فروغِ ادب کی نگاہِ انتخاب پر افسوس۔ لیکن جب ہم نے مضمون دیکھا تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ابوالخیر صاحب کی تحریر میں اس قدر شگفتگی و شادابی اور بے تکلفی اور روانی ہے؟ اور قلم کی روانی کے ساتھ سینے کی فراخی بھی۔ وہ فراخی جو بغیر کسی بناوٹ کے کھلے بندوں اس کا اعتراف و اظہار کر دیتی ہے کہ "میں نے ان کی صحبت میں بے پڑھے بہت کچھ پڑھا۔ اور انھوں نے بے سکھائے مجھے بہت کچھ سکھایا"۔ کس قدر مختلف ہے یہ بڑا بھائی اپنے چھوٹے بھائی سے۔ مضمون کے آخر میں انھوں نے نیاز کی ایک کمزوری بھی بتائی ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> وہ کمزوری ان کی تنگ دلی اور تنگ نظری ہے۔ وہ بحیثیت نقاد کی حد سے گذر جاتے ہیں۔ اور جس سے ذرا سا بھی کوئی اختلاف ہو اس کے ساتھ انصاف نہیں کرتے۔ یہ بات ان کے درجہ سے فروتر ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ جس قدر یہ بات دونوں غیر مزیّنہ ہیں، اسی قدر زیادہ وہ اس بے اعتدالی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ہم نہ تو نیاز صاحب کے عقیدتمندوں میں ہیں اور نہ ہی ان کی وکالت کے دعویدار۔ لیکن ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ انھیں اور جو کچھ جی میں آئے کہہ لیجئے لیکن تنگ دل اور تنگ نظر تو کبھی نہیں کہا جا سکتا۔ نیاز کی تنقید بیشک سخت ہوتی ہے۔ لیکن یہ شدت اور سختی کسی تنگ دلی یا تنگ نظری پر مبنی نہیں ہوتی۔ جہاں تک مذہبیات کا تعلق ہے ان کی تنقید میں شدت اور سختی ہی نہیں، بلکہ بیباکی (اور بعض اوقات گستاخی) بھی آ جاتی ہے۔ (اور یہ وہ مقام ہے جہاں ہمیں اس سے اختلاف اور سخت اختلاف رہا ہے اور اب بھی ہے۔ بلکہ ہم ان کے بہت سے معتقدات و نظریات کو بھی غلط سمجھتے ہیں لیکن یہ چیز ردِ عمل ہوتی ہے غلط مذہب کے علمبرداری کی جہالت اور المذہبی کا۔ جہاں تک ان کی ادبی تنقیدوں کا تعلق ہے چونکہ ان کا اپنا معیارِ ادب بہت بلند ہے۔ اس لئے وہ کسی ادبی پستی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں کہ یہ انداز تنقید عمدہ ہے یا معیوب۔ ہم کہنا صرف یہ

(بقایا صفحہ ۱۷)

حقائق و عبر

ٹیڑھی نظر

مولوی عبدالماجد صاحب دریاآبادی نے اپنے اخبار صدق (لکھنؤ) بابت ۱۱ فروری ۱۹۵۵ء میں "اشاعلاج" کے عنوان سے حسب ذیل شذرہ شائع فرمایا ہے۔

ایک خبر پاکستان کی:۔ "حقوقِ نسواں کی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ طلاق کے معاملے قانونی عدالتوں میں طے ہوا کریں۔ نیز اگر مرد ایک سے زیادہ بیوی کرنے کا خواہشمند ہو تو پہلے عدالت کی اجازت طلب کرے"۔

دوسری خبر ہندوستان کی:۔ "یو پی سرکار نے حکم جاری کیا ہے کہ آئندہ سے کوئی سرکاری ملازم ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کر سکتا جب تک پہلے اس کی اجازت حاصل نہ کرے"۔

(ان خبروں پر مدیر اخبار کا تبصرہ یہ ہے) تشابہت قلوبہم کی مثال اس سے بہتر اور کیا ملے گی؟ لیکن گمراہی پر اگر ساری دنیا کا اتفاق و اجماع ہو جائے جب بھی ضلال ضلال ہی رہے گا۔ اس کا نام ہدایت نہ پڑ جائے گا۔ اور تاریکی کو روشنی نہ سمجھا جائے گا"۔

تشابہت قلوبہم:۔ قرآن میں اس مقام پر آیا ہے (۲/۱۱۸) جہاں کہا گیا ہے کہ انکار اور گمراہی کی یہ باتیں یہی لوگ نہیں کرتے۔ ان سے پہلے لوگ بھی اس قسم کی باتیں کرتے رہے ہیں ان سب کے دل ایک ہی جیسے ہیں۔ لیکن ہمارے مولوی صاحبان کی حالت یہ ہے کہ اگر پاکستان امتناعِ شراب کا حکم نافذ کر دے اور ادھر ہندوستان والے بھی اپنے ہاں شراب کو ممنوع قرار دیدیں تو یہ کہینگے "تشابہت قلوبہم"

اب یہ دیکھئے کہ جس چیز کو مولوی صاحب نے گمراہی اور تاریکی قرار دیا ہے اس کی پوزیشن قرآن کی رو سے کیا ہے۔ (جیسا کہ اس سے پہلے کئی بار لکھا جا چکا ہے۔) ایک سے زیادہ بیوی کرنے کے متعلق قرآن میں ایک ہی جگہ ذکر آیا ہے اور وہ آیت یوں ہے۔ وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانكِحُوا ..... (۴/۳)
(اگر تمہیں ڈر ہو کہ تم بے باپ کے بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو تم ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کر سکتے ہو) اب سوچئے کہ اس بات کا فیصلہ کون کرے گا کہ معاشرہ میں ایسے حالات پیدا ہو چکے ہیں کہ بے باپ کے بچوں اور بے شوہر کی عورتوں کے ساتھ عدل و انصاف کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ انہیں مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا جائے۔ یہ بات یقیناً معاشرہ کے اجتماعی نظم کے طے کرنے کی ہوگی نہ کہ افراد کی الگ الگ۔

اب لیجئے طلاق کا معاملہ۔ اس کے متعلق بھی قرآن میں ہے۔ وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا ..... (۴/۳۵)

اگر تمہیں کسی میاں بیوی میں باہمی کشمکش کا ڈر ہو تو تم ان میں ثالث مقرر کرو۔ اس طرح کہ ایک ثالث مرد کے خاندان کا ہو اور ایک عورت کے خاندان کا۔ غور کیجئے۔ معاملہ "میاں بیوی" کا ہے۔ اور حکم یہ ہے کہ "اِنْ خِفْتُمْ"۔ اگر تمہیں ان کی باہمی آویزش کا خطرہ ہو۔ اس "تمہیں" (خِفْتُمْ) پر غور کیجئے۔ پھر آگے ہے فَابْعَثُوا۔ "تم ثالث مقرر کرو"۔ کوئی ان مولوی صاحب سے پوچھے کہ یہ کس سے ہے۔

فَابْعَثُوا کا حکم کسے دیا جا رہا ہے۔ کیا یہ عدالت ہی سے نہیں کہا جا رہا۔ اس لئے اگر پاکستان میں حقوقِ نسواں کی کمیٹی نے یہ تجویز کی ہے کہ طلاق کا معاملہ عدالت طے کیا کرے تو کیا یہ عین قرآن کے مطابق نہیں؟ اور اگر ہندوستان کی حکومت نے بھی اس معاملہ کو افراد پر نہیں چھوڑ دیا تو کیا یہ بھی قرآن کی بتائی ہوئی شکل کی طرف اقدام نہیں۔ لیکن مولوی صاحبان کے نزدیک قرآن کا بتایا ہوا دین تو دین ہے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک شریعت صرف وہ ہے جو حکومت کے دورِ استبداد میں وضع ہوئی۔ اور جس میں ہر بالادست نے خدائی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ اب اگر کہیں سے اس دورِ استبداد کی یادگار کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی ہے تو مولوی صاحبان (جو ہمیشہ استبداد کے حامی اور عدل کے دشمن رہے ہیں) اسے ضلالت اور تاریکی قرار دیکر "اسلام خطرے میں ہے" کے نعرے بلند کرنے شروع کر دیتے ہیں۔ وہ خواہ آ... عین قرآن کے مطابق ہی کیوں نہ ہو؟

لیکن انہیں کون بتائے کہ سورج نکل کر ہی رہتا ہے۔ خواہ وہ چمگادڑ کی آنکھ میں کتنا ہی کیوں نہ کھٹکے ـــ قرآن کے حقائق ابھر کر ہی رہیں گے خواہ مُلّا پر یہ کتنا ہی شاق کیوں نہ گزرے۔

اندرونِ ہند

بھارت میں سیکولرازم کا مطلب غالباً اس وقت یہ ہے کہ وہاں کے کسی شعبۂ زندگی میں اسلامی اثرات کا پرتو نہ پڑنے پائے لیکن زندگی کے ہر شعبہ میں ہندو روایات و نظریات کو اس طرح سے شامل کر دیا جائے کہ انہیں سیکولرازم کا جزو قرار دیا جا سکے۔ یوں تو بھارت کی سیکولر حکومت مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت پر ہر چہار طرف سے حملہ آور ہے۔ لیکن اس کی نا مس تو یہ مسلمان بچوں کے نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر ہے چنانچہ وہاں زبردستی مسلمان بچوں اور بچیوں کو ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو سراسر ہندو پرستانہ خیالات سے بھری پڑی ہیں۔ معاصر الجمعیت دہلی نے سرکاری اسکول اور مسلمان بچے کے عنوان سے ایک پُر درد انگیز اداریہ لکھا ہے۔ اس اداریہ کی آخری چند سطریں درج ذیل ہیں۔

"ہمیں اس بات کی شکایت ہے کہ سرکاری اسکولوں میں بنیادی تعلیم کے تحت جو نصاب پڑھایا جاتا ہے وہ مسلمان بچوں کو موافق نہیں آ سکتا۔ اس کے باعث مسلمانوں میں ہر جگہ تشویش بلکہ بدگمانی کا اظہار کیا جا رہا۔ اور ہمیں اس کے بارے میں شکایتیں بھی موصول ہو رہی ہیں۔..... عام طور پر نصاب کی کتابیں ہندی میں ہیں اور مسلمان بچوں کو لازمی تعلیم کے تحت ان کو لینا پڑتا ہے۔ لیکن یہ کتابیں ہندو کلچر ہندو دیو مالا، ہندو اثرات سے بھری پڑی ہیں۔ اور مسلمان بچوں کو بھی وہی کچھ پڑھنا پڑتا ہے جو ہندو بچے پڑھتے ہیں۔ بلاشبہ ایسی کتابیں ہندو بچوں کو ضرور پڑھانی چاہئیں لیکن یہ تو خیال رکھنا چاہیئے کہ نظریات کے اعتبار سے مسلمان بچے ہندو بچے اور ہندو بچے مسلمان بچے نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر ہم الٰہ آباد کے ایک گرلز اسکول کا ذکر کریں گے۔ اس سکول میں ۹۰ فیصدی مسلمان بچیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ پہلے اس سکول میں اردو کی تعلیم کا بھی انتظام تھا اور ساتھ ہی مذہبی تعلیم کا بھی۔ مگر اب اس میں اردو اور مذہبی تعلیم کا کوئی نشان باقی نہیں رہا ہے۔ صرف ہندی پڑھائی جاتی ہے۔ کوئی ہرج نہیں۔ اگر ہندی ذریعہ تعلیم ہو کیونکہ وہ سرکاری زبان ہے جسے ہر ہندوستانی کو سیکھنا چاہیئے۔ مگر شکایت یہ ہے کہ ان کتابوں پر دھرم کا رنگ غالب ہے۔ اس پر بس نہیں۔ مسلمان لڑکیوں کو کرشن کا گوپی بنایا جاتا ہے کبھی انھیں رام، لچھمن اور سیتا کا ناٹک کرایا جاتا ہے۔ جھنڈا گیت تو عام بات ہے اور پرارتھنا کے بعد جے ہند کے نعرے لگوانا بھی تعلیم کا جزو ہے۔ اب مسلمان سخت پریشان ہیں کہ وہ کیا کریں۔ اور اپنے بچوں کو اجنبی اثرات سے کس طرح بچائیں۔ ہم مان لیتے ہیں کہ حکومت کی یہ پالیسی نہیں ہے کہ مسلمان بچے ایسی کتابیں پڑھیں جو ایک فرقہ کے نظریات کی حامل ہوں۔ نہ ان کی خواہش یہ ہے کہ مسلمان بچوں سے ہندو دھرم کے کھیل کرائے جائیں۔ مگر یہاں سوال پالیسی اور خواہش کا نہیں بلکہ عمل کا ہے۔ اور عمل یہ ہے کہ محکمہ تعلیم نے ایسی ہی کتابیں منظور کر رکھی ہیں جن کے ہر صفحہ پر ہندو روایات کا رنگ موجود ہے۔ اور پھر اسکولوں میں جو ٹیچر مقرر کئے جاتے ہیں وہ خود بھی حکومت کی پالیسی اور سیکولرازم کو ڈائنامیٹ کرتے ہیں۔ اور زبانی بھی ایسی باتیں بتاتے ہیں اور ایسی ترکیبیں کراتے ہیں جن کو مسلمان بچوں کی اسلامیت کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ معاملہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ بعض کے دینی خونشن کو بھی اس پر احتجاج کرنا پڑا۔ اور مسلم اخبارات بھی مجبور ہوئے ہیں کہ اس کے خلاف حکومت سے احتجاج کریں۔ اگر صورت حال یہ ہے تو ہم جمہوریت کا پورا احترام کرتے ہوئے حکومت سے دریافت کریں گے کہ وہ اپنی روش کو کب بدلے گی؟ اور مسلمان کب تک احتجاج کرنے پر مجبور کئے جائیں گے؟"

واضح رہے کہ بھارت حکومت کے وزیر تعلیم مسلمان ہیں۔ اور مسلمان بھی مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اس سے ظاہر ہے کہ وہاں کی حکومت میں ایک مسلمان وزیر کا وجود مسلمانوں کے حقوق کا کہاں تک تحفظ کر سکتا ہے؟ لہٰذا ہندی مسلمان کو اس فریب میں نہیں رہنا چاہیئے کہ تعلیم کا وزیر مسلمان ہے اس لئے ان کے کم از کم تعلیمی حقوق محفوظ ہیں۔ انھیں اس کے لئے بھی خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔ اور کچھ باہمی اتحاد اور اجتماعیت ہی سے ہو سکے گا۔

حدیث کے متعلق مکمل معلومات
مقامِ حدیث
دیکھیے

مطبوعاتِ طلوعِ اسلام

معراج انسانیت — از پرویز۔ سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ بڑے سائز کے تقریباً نو سو صفحات اعلیٰ ولایتی گلیزڈ کاغذ مضبوط و حسین جلد مع گرد پوش۔ قیمت بیس روپے

ابلیس و آدم — از پرویز۔ سلسلۂ معارف القرآن کی دوسری جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصۂ آدم۔ ابلیس۔ جنات۔ ملائکہ۔ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

قرآنی دستور پاکستان — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۳۲ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے اس کے جواب میں پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۲۸۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام — از پرویز۔ نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا شگفتہ، مدلل اور اچھوتا جواب۔ بڑے سائز کے ۲۷۵ صفحات۔ قیمت چار روپے

قرآنی فیصلے — روزمرہ کی زندگی کے ساتھ اہم مسائل و معاملات پر قرآن کی روشنی میں بحث۔ چار سو آٹھ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسباب زوال امت — از پرویز۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بتایا گیا ہے کہ ہمارا مرض کیا ہے اور علاج کیا۔ ۱۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

جشن نامے — ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر، سات سالہ دورِ آزادی کی سمٹی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناس رسول — یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول! مزاج شناس کون ہے؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ ۲۴۸ صفحات۔ قیمت چار روپے

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات۔ اور قیمت فی جلد چار روپے

فردوس گم گشتہ — از پرویز۔ ان مضامین کا مجموعہ جنہوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا۔ خالص ادبی نقطۂ نگاہ سے اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۴۱۶ صفحات۔ قیمت چھ روپے

نوادرات — از علامہ اسلم جیراجپوری۔ علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ چار سو صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت — (از پرویز) مسلمان کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ رہنے سہنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت دو روپے

نوٹ: تمام کتابیں مجلد ہیں اور گرد پوش سے آراستہ۔ محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار۔

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام پوسٹ بکس نمبر ۳۱۳، کراچی

بَابُ المراسلات

لوگ حقائق سے انکار کیوں کرتے ہیں؟

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔ "دین کے جو حقائق طلوع اسلام میں شائع ہوتے ہیں یا جو کچھ جناب پرویز صاحب اپنی تصانیف میں لکھتے ہیں وہ اس قدر صاف۔ واضح۔ مدلل اور قرآن کے مطابق ہوتا ہے کہ انسان اسے صحیح اور حق ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ اکثر لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ بالخصوص جماعت اسلامی والوں کو میں نے دیکھا ہے کہ وہ طلوع اسلام اور پرویز صاحب کا نام تک بھی سننا گوارا نہیں کرتے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ وہ حق کو کیوں نہیں مانتے؟"

طلوع اسلام آپ نے جو اصولی سوال پوچھا ہے کہ اس قدر واضح اور مدلل ہونے کے باوجود اکثر لوگ اسے کیوں نہیں مانتے اور اس کی کیوں مخالفت کرتے ہیں تو یہ سوال اتنا اہم اور مشکل ہے کہ اس کا جواب ایک خط میں نہیں دیا جا سکتا۔ حق کے ساتھ ہمیشہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ لوگوں نے اس کے ماننے سے انکار کیا ہے اور اس کی طرف دعوت دینے والوں کی سخت مخالفت کی ہے اور انہیں کرب انگیز ایذائیں دی ہیں۔ اس بات کے سمجھنے کے لئے انسان کے قلبی اور ذہنی رجحانات۔ اس کی ذہنی سطح۔ اس کے غیر شعوری میلانات، وراثت، ماحول، تربیت تعلیم کا اثر۔ غلط معتقدات کی گرفت۔ سوسائٹی کا خوف۔ اور متعدد دیگر عوامل و عناصر کا تجزیہ اور ان کے متعلق تفصیلی بحث کی ضرورت ہے۔ ان چیزوں کو ایک مبسوط کتاب میں تو بیان کیا جا سکتا ہے لیکن ایک خط کے جواب میں نہیں۔ خود قرآن نے ان عوامل و عناصر کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس کے کما حقہٗ سمجھنے کے لئے بھی مذکورۂ صدر اجزاء کے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس اصولی سوال کا جواب (اس طرح رسالہ میں دینا) ممکن نہیں۔ البتہ جہاں تک اس متعین سوال کا تعلق ہے کہ جماعت اسلامی والے ان حقائق کو کیوں نہیں سمجھتے) تو اسے مختصر الفاظ میں سمجھا جا سکتا ہے۔

سب سے پہلے یہ سمجھئے کہ انسان بالعموم اسی مذہب سے مطمئن ہو جاتا ہے جو اس کی ذہنی سطح کے مطابق ہو۔ جو حقائق اس کی ذہنی سطح سے ذرا بھی اونچے ہوں اور ان کے لئے غور و فکر کی ضرورت ہو وہ ان کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اپنے منکرین اور مخالفین کو بار بار مطعون کرتا ہے کہ یہ لوگ ان حقائق پر غور و فکر نہیں کرتے۔ وہ عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ وہ سوچتے سمجھتے نہیں اور یونہی اندھادھند اپنی روش پر چلے جاتے ہیں اور ان حقائق کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ اس بنیادی اصول کی روشنی میں آپ دیکھئے کہ جو لوگ جماعت اسلامی کے پیش کردہ مذہب کو "حقائق" سمجھ کر قبول کرتے اور ان پر سر دھنتے ہیں ان کی ذہنی سطح کیا ہو سکتی ہے؟ مثال کے طور پر مودودی صاحب کی ایک تحریر کو لیجئے۔ وہ معراج نبویؐ کے متعلق لکھتے ہیں۔

جبرئیل نے (رسول اللہؐ) کی سواری کے لئے ایک جانور پیش کیا جس کا رنگ سفید اور خچر سے چھوٹا تھا۔ برق کی رفتار سے چلتا تھا اور اسی مناسبت سے اس کا نام براق تھا۔ پہلے انبیاء بھی اس نوعیت کے سفر میں اسی سواری پر جایا کرتے تھے ...... بیت المقدس پہنچ کر آپ براق سے اتر گئے اور اسی مقام پر اسے باندھ دیا جہاں پہلے انبیاء اسے باندھا کرتے تھے ...... اس کے بعد ایک سیڑھی آپ کے سامنے پیش کی گئی اور جبرئیل اسی کے ذریعے آپ کو آسمان کی طرف لے چلے ...... وہاں کچھ لوگوں کو دیکھا جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں .... کچھ وہ تھے جو جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے ..... ایک جگہ دیکھا کہ پتھر میں ایک شگاف ہوا اور اس میں سے ایک بڑا موٹا سا بیل نکل آیا ..... پھر دیکھا کچھ عورتیں اپنی چھاتیوں کے بل لٹک رہی ہیں۔ ...... واپسی میں آپ اسی سیڑھی سے اتر کر بیت المقدس آئے (جب صبح اٹھ کر لوگوں نے آپ سے اس سفر کا ثبوت مانگا تو) آپ نے فرمایا کہ جاتے ہوئے میں فلاں مقام پر فلاں قافلہ پر سے گزرا .... قافلہ والوں کے اونٹ براق سے بھڑک گئے .... اور واپسی پر فلاں قبیلہ کے لوگوں کے برتن میں سے میں نے پانی پیا جبکہ قبیلہ والے سب سو رہے تھے۔

(ترجمان القرآن بابت اگست ۱۹۵۱ء)

آپ پہلے اس تحریر کے مصنف کو لیجئے۔ اگر وہ ان باتوں کو فی الواقعہ صحیح مانتا ہے تو اس سے اس کی ذہنی سطح اور علمی بلندی کا احساس ہو سکتا ہے۔ (واضح رہے کہ قرآن میں ان میں سے کسی ایک بات کا بھی ذکر نہیں) اور اگر وہ ان باتوں کو صحیح تو نہیں سمجھتا لیکن انہیں اس لئے پیش کر رہا ہے کہ یہ عوام کے جی لگتی ہیں لہٰذا اس طرح وہ اس کے ساتھ رہیں گے، تو اس سے اس کی سیرت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی صورت ہو، ایسا شخص قرآن کے بلند حقائق کو پا کس طرح سکتا ہے؟ پہلی صورت میں یہ قرآن تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور دوسری صورت میں قرآن اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

اب رہے وہ لوگ جو اس کی ان (پیش کردہ) باتوں کو صحیح سمجھتے ہیں تو ان کی ذہنی سطح کے متعلق بھی اندازہ ہو سکتا ہے اور اگر ان میں ایسے لوگ ہیں جو اس کی ان باتوں کو تو صحیح نہیں سمجھتے لیکن اس کی تغلیط بھی نہیں کرنا چاہتے کیونکہ وہ ان کا امیر اور قائد ہے یا اس کے ساتھ رہنے میں اس کے مفاد وابستہ ہیں تو ان لوگوں کی سیرت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آپ سوچئے کہ ان حالات میں ان لوگوں سے کیسے توقع کی جائے کہ وہ دین کے ان حقائق کو سمجھ لیں گے جسے طلوع اسلام پیش کرتا ہے یا جو ارباب نظر کو پرویز صاحب کی کتابوں میں ملتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حقائق ان لوگوں کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتے یہ سمجھ میں آ سکتے ہیں بشرطیکہ یہ لوگ انہیں سمجھنا چاہیں۔ (طلوع اسلام کے حلقہ میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کی تعلیم کچھ زیادہ نہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس کے پیش کردہ حقائق کو خوب سمجھتے ہیں) قرآن کے سمجھنے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اسے سمجھنے کی خواہش دل میں ہو۔ لیکن (قرآن بتاتا ہے کہ) مفاد پرست گروہ ایسے حالات پیدا کرتا رہتا ہے جن سے لوگوں کے دل میں قرآن سمجھنے کی خواہش ہی پیدا نہ ہو۔ وہ کہیں اس کی طرف دعوت دینے والوں کو (معاذ اللہ) کاذب۔ ساحر۔ مفتری۔ مجنون قرار دیتا ہے اور کہیں لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتا ہے کہ یہ تمہیں تمہارے اسلاف کے مذہب و مسلک سے بیگانہ بنا دیں گے۔ اور تمہارے معبودوں کو تم سے چھڑا دیں گے (قرآن میں ان تمام امور کی تفصیل مذکور ہے)۔ پھر وہ ایسے طریقے اختیار کرے گا جس سے لوگوں کے کانوں تک قرآن کی آواز نہ پہنچنے پائے۔ اس طرح یہ گروہ لوگوں کو حقائق سے اس درجہ متنفر بنا دیتا ہے کہ انہیں ان کے نام سے چڑ پیدا ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ جس چیز سے انسان کو اس قدر نفرت پیدا ہو جائے، اس کے دل میں اسے سمجھنے کی خواہش کبھی نہیں پیدا ہو سکتی۔ یعینہٖ یہی چیز جماعت اسلامی نے طلوع اسلام اور پرویز صاحب کی تصانیف کے ساتھ کر رکھی ہے۔ انہوں نے مختلف لیبل تراش رکھے ہیں جنہیں وہ وقتاً فوقتاً ان پر چسپاں کر کے عوام کو ان سے متنفر اور متوحش کرتے رہتے ہیں۔ "مقام رسالت کے منکر سنت رسول اللہؐ کے مخالف۔ حکومت کے ایجنٹ۔ اشتراکیت کے داعی۔ فتنہ پرداز" اور نہ معلوم کیا کیا۔ مقصد ان تمام مکذوبات و اختراعات سے یہ ہے کہ عوام اس لٹریچر سے متنفر رہیں اور اسے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کریں۔ یہ ہے وہ ٹکنیک جس سے یہ حضرات لوگوں کو حقائق سے دور رکھتے ہیں تاکہ وہ ان کی قیادت کے وابستۂ فتراک رہیں۔ ورنہ یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص میں سمجھنے کی صلاحیت ہو اور وہ قرآنی حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر بھی وہ حقائق اس کی سمجھ میں نہ آئیں۔ ان گالیاں دینے والوں میں آپ دیکھیں گے کہ اکثریت ان کی ہوگی جنہوں نے محض سن رکھا ہوگا کہ طلوع اسلام منکر حدیث ہے اور پرویز ایک نیا دین پیدا کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے نہ طلوع اسلام کو پڑھا ہوگا اور نہ ہی پرویز کی کسی کتاب کو دیکھا۔ یا ان لوگوں کی جو ان چیزوں کے پڑھنے سے پہلے ہی فیصلہ کر چکے ہوں گے کہ ہم نے بہرحال ان کی مخالفت کرنی ہے۔ یا ان کی جو سیڑھی سے آسمانوں پر چڑھنے کی داستانوں سے خوش ہو جاتے اور سبحان اللہ کہہ کر جھوم اٹھتے ہیں۔ فرمائیے کہ یہ لوگ قرآنی حقائق کو کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں اور مقام نبوت ان کی سمجھ میں کیسے آ سکتا ہے؟

مزاج شناس رسول

صفحات ۴۳۶ قیمت چار روپے

بین الاقوامی جائزہ

فارموسا سے متعلق جو تعطل پیدا ہو گیا تھا وہ ختم تو ہو گیا ہے لیکن کسی سمجھوتے کی کوئی صورت ابھی تک پیدا نہیں ہو سکی۔ لندن کے ساتھ ماسکو بھی سفارتی مذاکرات کا مرکز بن گیا ہے۔ ان خفیہ مذاکرات کا پھر سے شروع ہو جانا امید افزا ضرور ہے لیکن مفاہمت کی کوئی قابل قبول صورت سامنے آ سکی۔

امریکی سکریٹری آف سٹیٹ مسٹر ڈلیز بنکاک کانفرنس سے فارغ ہو کر فارموسا گئے تو وہاں پہنچ کر انہوں نے سرخ چین کو متنبہ کیا کہ اگر اس نے کیموئے اور متسو پر حملہ کیا تو وہ اپنے آپ کو امریکی حملے کی زد سے محفوظ تصور نہ کرے۔ انہوں نے سرخ چین سے اپیل کی کہ وہ منہ میں امن کے الفاظ لئے پھرنے کی بجائے عملاً امن پر کاربند ہوں کیموئے اور متسو چین کے ساحل کے قریب ہیں لیکن آیا ان پر حملہ کی صورت میں امریکہ جوابی حملہ کرے گا یا نہیں۔ اس کا فیصلہ صدر آئزن ہاور ہی کریں گے۔ فارموسا سے واپس اپنے وطن پہنچ کر مسٹر ڈلیز نے اس بات کا اظہار کیا کہ اشتراکی ایشیائی آزاد اقوام کو مغلوب کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ ان بیانات سے امریکہ کے عزائم کا پتہ چلتا ہے۔ وزیر اعظم برما نے چینی وزیر اعظم کے حوالہ سے جو تجویز پیش کی تھی کہ امریکہ کا ایک نمائندہ غیر رسمی طور پر چین جائے اسے امریکہ میں بہ نظر استحسان نہیں دیکھا گیا۔

واشنگٹن میں کہا جا رہا ہے کہ جب ڈاگ ہیمر شولڈ کا مشن ناکام ہو چکا ہے تو مزید مشن بھیجنے سے کیا فائدہ ہو گا۔ لندن میں یکم مارچ کو مسٹر چرچل نے یہ اعلان کیا کہ جہاں تک ان کی معلومات کا تعلق ہے امریکہ کی ایٹمی قوت روس سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ماسکو اور پیکنگ میں اس بیان پر کڑی نکتہ چینی کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ برطانیہ ہائیڈروجن بموں کا باعث ہو رہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ امریکہ بھی ان کی زد سے محفوظ نہیں۔ یہ بیانات مبارزت طلبانہ ہیں لیکن جیسا کہ چرچل نے کہا ہے باہمی ڈر سے امن کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ امن عالم کی یہ بنیاد کس قدر کمزور ہے اسے کون بتائے کہ ان اختلافات کی جڑیں اقتصادی ناہمواریاں ہیں۔ ناہمواریاں مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ تم ہمواریاں پیدا کرتے جاؤ۔ تخریبی کاروائیوں کو تعمیری کاروائیوں سے دور کرو۔

ترکی کی کوششوں سے ایک طرف مشرق وسطیٰ میں اتحاد کی طرح پڑ چکی ہے تو دوسری طرف بلقان میں اتحاد و تعاون کا غلغلہ بلند ہو رہا ہے گذشتہ اگست میں ترکی، یوگوسلاویہ اور یونان نے جو "بلقان اتحاد" مرتب کیا تھا اس کے مطابق تینوں معاہد ممالک کی ایک مشترکہ "بلقان مشاورتی اسمبلی" کی تشکیل کی گئی ہے یہ اسمبلی وقتاً فوقتاً بلقانی معاملات پر غور و خوض کیا کرے گی۔ اتنے قلیل عرصہ میں ایسی مجلس قائم کر کے بلقانی ریاستوں نے مغربی یورپ کے سامنے قابل تقلید مثال پیش کی ہے۔ وہاں دو سال سے اوپر عرصہ ہو چکا ہے لیکن ایسی مجلس ابھی تک وجود میں نہیں آ سکی۔ یہ تجربہ کامیاب ہو گیا تو بلقان میں توازن اور استحکام کی دائمی صورت پیدا ہو جائے گی۔ غور کیجئے ترکی نے قدامت پرستی کا جوا اتار کر اپنی پوزیشن کو کس قدر مضبوط بنا لیا ہے۔

مجلس اقبال

(صفحہ ۹ سے آگے)

حیثیت سے غور کر سکوں۔

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں۔ میری قوت طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے۔ اور عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے۔ اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسن معاملت کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گرانمایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

میں اس بارے میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں یعنی اسرار خودی پر چند تشریحی نوٹ لکھے تھے جنہیں آپ نے دیباچۂ اسرار میں شامل کر لیا ہے۔ ان تفسیری حواشی میں میں نے مغربی مفکرین کے افکار و عقائد کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے یہ طریق محض اس لئے اختیار کیا گیا تھا تاکہ انگلستان کے لوگ میرے خیالات بآسانی سمجھ لیں۔ ورنہ قرآن حکیم، صوفیائے کرام اور مسلمان فلسفیوں کے افکار سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے اسرار کے پہلے ایڈیشن میں بزبان اردو جو دیباچہ لکھا ہے اس میں یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ "اسرار" کا فلسفہ مسلمان صوفیا اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ اور تو اور وقت کے متعلق برگسان کا عقیدہ بھی ہمارے صوفیوں کے لئے نئی چیز نہیں۔ قرآن الہیات کی کتاب نہیں بلکہ اس میں انسان کی معاش و معاد کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے پوری قطعیت سے کہا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا تعلق الہیات کے ہی مسائل سے ہے عہد جدید کا ایک مسلمان اہل علم جب ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے جن کا مبداء اور سرچشمہ قرآن مجید ہے تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہل مغرب اسلامی فلسفے کی تعلیم سے ناآشنائے محض ہیں۔ کاش مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ میں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کراتا کہ مختلف قوموں کے فلسفیانہ خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔

نقد و نظر

(صفحہ ۱۵ سے آگے)

چاہتے ہیں کہ ان کی تنقید کی تلخی، تنگ دلی اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہوتی۔ ہمیں پھر دھرانے دیجئے کہ نیاز اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود تنگ دل اور تنگ نظر نہیں ہے۔

سب سے بڑی چیز جو اس مجموعہ میں ہمیں کھٹکی وہ اب سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فہرست میں اقبال کا نام نظر آیا تو ہم نے سب سے پہلے اس مضمون کو پڑھا۔ اور پڑھ کر افسوس ہوا۔ یہ مضمون خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ مضمون تو ہے اقبال کی شخصیت کے متعلق لیکن اس میں اقبال بے چارا محض "طرح مصرعہ" بن کر رہ گیا ہے۔ غزل ساری خلیفہ صاحب کی ہے۔ پھر اس میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو ہم نے اس سے پہلے کسی سے نہیں سنیں اور جنہیں اقبال کی طرف منسوب کرنے کو جی نہیں مانتا اس لئے نہیں کہ اقبال کی عقیدت ایسا کرنے سے مانع ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ باتیں اقبال کی سیرت سے کچھ بعید سی ہیں۔ اقبال اب ہم میں ہے نہیں جو ان باتوں کی تردید یا توثیق کر سکے۔ لہذا (ان کی وفات کے بعد) اس قسم کی باتیں محض روایات کہلا سکتی ہیں۔ اور وہ بھی "خبر آحاد" اور روایات میں خبر آحاد کی جو حیثیت ہوتی ہے اس سے سب واقف ہیں۔ اس باب میں مولانا ابوالکلام آزاد بہت خوش قسمت رہے کہ انہیں غلام رسول مہر جیسا شخصیت نگار مل گیا۔ کیا ادارہ فروغ ادب کو اقبال کے لئے بھی ایسا موزوں صاحب قلم نہیں مل سکتا تھا۔ بالآخر راجہ حسن اختر اور سید نذیر نیازی بھی تو اس لاہور میں موجود تھے۔ نہ معلوم اقبال کے لئے لوگوں کی نگاہیں "با ما آشنا بود" کے دعویداروں کی طرف ہی کیوں اٹھتی ہیں۔!!

آپ
طلوع اسلام کی
مدد کیسے کر سکتے ہیں؟

۱۔ اپنے احباب کو طلوع اسلام کا خریدار بنایئے۔

۲۔ اپنے شہر میں طلوع اسلام کی ایجنسی قائم کیجئے۔

۳۔ کسی مقامی ایجنٹ کو تیار کیجیئے کہ وہ طلوع اسلام کا لٹریچر منگائے۔

۴۔ ممکن ہو تو اپنے علاقے سے طلوع اسلام کیلئے اشتہار مہیا کیجئے۔

ابلیس و آدم
(قرآنی نظریۂ ارتقاء)
صفحات ۳۷۶ قیمت آٹھ روپے

قرانی فکر کی نشر و اشاعت

آپ اس میں کس طرح حصہ لے سکتے ہیں

طلوع اسلام قرانی فکر کی فشر و اشاعت کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اسکا لٹریچر جسقدر زیادہ شائع ہوگا اسی قدر قرانی فکر عام ہوگی اور اسی نسبت سے قرانی انقلاب قریب سے قریب تر آتا جائیگا۔ اس کے لئے طلوع اسلام نے "پیشگی خریداران" کی اسکیم جاری کی ہے۔ یعنی اگر آپ ایک سو روپیہ پیشگی ادا کردیں (یک سشت یا پچیس روپے کی ساھانہ اقساط میں) تو آپ کا حساب کھول لیا جائیگا اور اس میں سے آپ کو طلوع اسلام کی شائع کردہ کتابیں بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتی جائینگی تآنکہ آپ کی پیشگی رقم پوری نہ ہوجائے۔ اس طرح - - -

- آپ کی پیشگی رقم سے ھمیں مزید کتابیں شائع کرنے میں سہولت مل جائیگی۔ اور
- آپ کو طلوع اسلام کی کتابیں بلا محصول ڈاک خود بخود ملتی چلی جائینگی۔ اگر آپ اس وقت تک اس اسکیم میں شامل نہیں ہوئے تو اب شامل ہوجائیے۔

معاملہ کی ضروری باتیں

- طلوع اسلام آپ کا اپنا ادارہ ہے اس لئے اس سے اسی طرح کا برتاؤ کیجئے جس طرح اپنوں سے برتاؤ کیا جاتا ہے۔ یہ بھی آپ سے ایسا ھی برتاؤ کریگا۔
- حساب میں بعض اوقات غلطی ہوسکتی ہے۔ ایسی غلطی باھمی افہام و تفہیم سے صاف کرلیجیے۔
- رسالہ کے انتظامی معاملات کے متعلق الگ خط لکھئے۔ کتابوں کے لئے الگ۔
- مضامین کے متعلق مدیر کے نام علحدہ خط لکھئے۔ نیز استفسارات مدیر کے نام الگ بھیجئے۔
- پتہ کی تبدیلی سے کم از کم دو ہفتہ پہلے اطلاع دیجئے۔
- پرچہ نہ ملنے کی اطلاع تاریخ اشاعت کے ایک ہفتہ کے اندر دیجئے۔ بعد میں رسالہ قیمتاً بھیجا جائیگا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ پوسٹ بکس نمبر ۷۳۱۳۔ کراچی۔ ۳

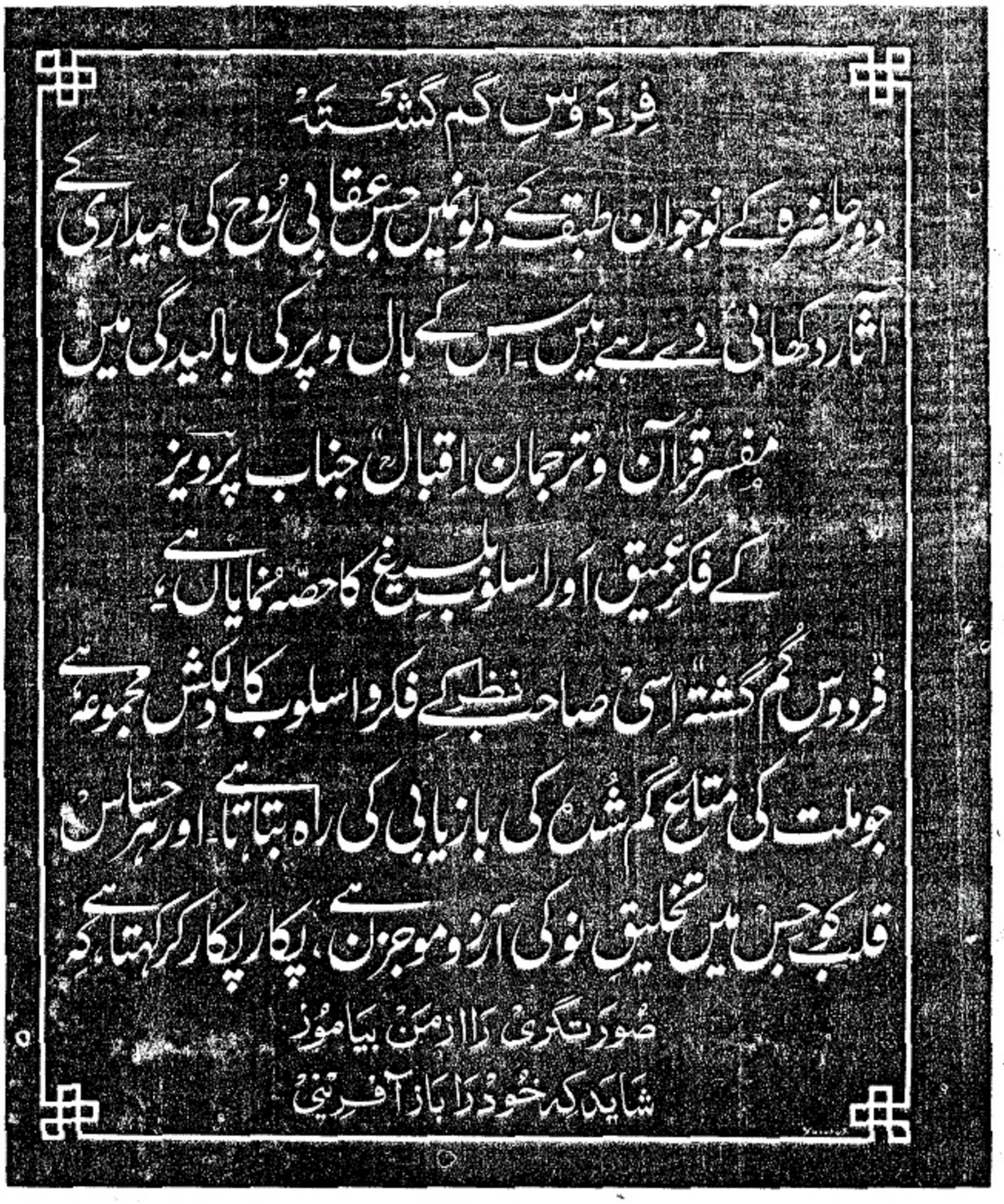

فردوسِ گم گشتہ

دورِ حاضرہ کے نوجوان طبقے کے دلوں میں جس عقابی رُوح کی بیداری کے آثار دکھائی دے رہے ہیں۔ اس کے بال و پر کی بالیدگی میں "مفسرِ قرآن" و "ترجمانِ اقبال" جناب پرویز کے فکرِ عمیق اور اسلوبِ بلیغ کا حصّہ نمایاں ہے۔

"فردوسِ گم گشتہ" اسی صاحبِ نظر کے فکر و اسلوب کا دلکش مجموعہ ہے جو ملت کی متاعِ گم شدہ کی بازیابی کی راہ بتاتا ہے۔ اور ہر حساس قلب کو جس میں تخلیقِ نو کی آرزو موجزن ہے، پکار پکار کر کہتا ہے کہ

صورتگری را از من بیاموز
شاید کہ خودرا باز آفرینی

ضخامت ۲۱۲ صفحات مجلد سع گرد پوش قیمت -/۶
علاوہ محصول ڈاک